ستمبر
۲۰۱۱ء

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۲۴، شمارہ ۸ ستمبر ۲۰۱۱ء/ ذوالقعدہ ۱۴۳۲ھ

مشمولات

عنوان	مصنف	صفحہ
اثبات سے پہلے نفی	مدیر	۲
O ہمارا دینی تناظر		
دینی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت	ڈاکٹر محمد امین	۳
تذکرہ چند دینی جرائد اور اکابر کا	پروفیسر رشید احمد انگوی	۱۷
علماء کرام کے درمیان اتحاد کی تجاویز	مدیر	۲۲
O پاکستانیات		
قومی یک جہتی کا فقدان	عبدالرشید ارشد	۳۲
O ہمارا تعلیمی تناظر		
صُفّہ ـ مسلم تعلیم کا رول ماڈل	ڈاکٹر انعام اللہ	۳۷
مغربی تعلیم کا زہر	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ	۴۰
O تفہیم مغرب ـ ڈائیلاگ		
ٹیکنالوجی اور اقدار	پروفیسر شاہد رشید	۴۴
	اسلام، مسلمان اور سائنس و	

ٹیکنالوجی — سید خالد جامعی ۴۶

عنوان	مصنف	صفحہ
O یادرفتگان		
ـ ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت	مدیر	۵۹
ـ حافظ نذر احمد		۶۱
O تعارف کتب	مبارک حیدر	۶۴

اثبات سے پہلے نفی

کبھی ہم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی'**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**' (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں یعنی پہلے ان سارے خداؤں (اِلہٰ) کا انکار کیا جائے جو درحقیقت اِلٰہ نہیں ہیں، اس کے بعد اس ذات باری (اللہ) کے اِلٰہ ہونے کا اقرار کیا جائے جو اکیلا اِلٰہ ہے۔ اس بات پر آپ جتنا غور کریں گے اس کا فطری، منطقی اور مبنی برحکمت ہونا آپ پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ جب تک پہلے شرک یعنی ان سارے جھوٹے خداؤں کا انکار نہ کیا جائے جو درحقیقت اِلٰہ نہیں ہیں اُس وقت تک اُس ایک اِلٰہ کی الوہیت کا اثبات (یعنی توحید کا اقرار) کرنا جو درحقیقت اکیلا اِلٰہ ہے بے سود بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے۔

اسی طرح آج اسلام کو واحد اور مکمل دین اور طرز زندگی ماننا بے معنی اور بے سود بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے جب تک ان سارے ادیان/طرز ہائے زندگی کا انکار نہ کیا جائے جو اسلام جیسے واحد اور مکمل دین سے مختلف اور متضاد بلکہ اس کے مخالف اور دشمن ہیں جن میں آج سرفہرست مغربی فکر و تہذیب ہے جو آج دنیا کا غالب دین ہے جس کے اہم عقائد میں ہیومنزم ہے (یعنی خدا کے مقابلے میں انسان کی خدائی)، سیکولرزم ہے (یعنی خدا کے احکام ساری انسانی زندگی کے لیے نہیں)، لبرلزم ہے (یعنی انسان آزاد ہے خدا کا پابند نہیں) کیپٹل ازم ہے (یعنی زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے) اور ایمپریسزم ہے (یعنی حق صرف وہ ہے جو عقل اور تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہو یعنی انسانی ہدایت کے لیے وحی کی حجیت کا انکار) گویا مغربی فکر و تہذیب کا مطلب ہے خدا، آخرت، قرآن اور رسول کا انکار۔

حاصل یہ کہ جو مسلمان آج اسلام کے واحد اور مکمل دین اور طرز حیات ہونے کا اثبات کرنے سے پہلے غیر اسلام (خصوصاً مغربی فکر و تہذیب) کے دین/طرز زندگی ہونے کا انکار نہیں کرتے ان کا اسلام کو واحد اور مکمل دین ماننا بے معنی اور بے سود ہے بلکہ لغو اور ناقابل قبول ہے۔

فکر و نظر ڈاکٹر محمد امین

دینی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی کی ضرورت

ہم نے البرہان کے پچھلے شمارے میں نئی طرز کے دینی مدارس قائم کرنے کی بات کی تھی وہ اتنی اہم بات ہے کہ کوئی نئی بحث چھیڑنے سے پہلے یا مضامینِ نو کے انبار لگانے کی بجائے اس پر برسوں بحث ہونی چاہیے لیکن اس خواہش کے پیش نظر کہ جو باتیں ہم برسوں سے سوچ رہے ہیں وہ کم ازکم علماء کرام اور دینی عناصر کے سامنے ایک دفعہ آ تو جائیں یہ سطور پیش خدمت ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ علماء کرام اور دینی عناصر میں سے سوچنے سمجھنے والے اصحاب ہماری تجاویز پر ضرور غور فرمائیں گے۔ نئی باتیں اور نئی تجاویز ابتداء میں غیر مانوس لگتی ہیں لیکن جب تکرار سے ان کے بارے میں سوچا جائے اور انہیں زیر بحث لایا جائے تو پھر وہ سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان پر عمل کا در وا ہوجاتا ہے۔ ہم اپنی تجاویز کے حق میں یا ان کے خلاف تحریروں کا خیر مقدم کریں گے۔ امین

علماء کرام اور دینی عناصر کی خدمت میں چند گزارشات

قوموں کی زندگی میں مذہبی قیادت فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اس سے نہ صرف کسی معاشرے میں مذہبی قیادت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس سے مذہبی قیادت کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے کردار پر نظر رکھے کہ وہ قائدانہ، رہنمایانہ (عامۃ الناس کو رہنمائی مہیا کرنے والا)، مثبت، تعمیری اور مؤثر ہے کہ نہیں؟

علماء کا کردار

پاکستان جیسے مسلم معاشرے میں علماء کرام کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ اِس بات کو اُس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اسلام کی رو سے ایک مسلمان کی ذمہ داریوں اور زندگی میں اس کے کردار کو نہ سمجھا جائے۔ چونکہ اس وقت تفصیل پیش نظر نہیں اس لیے تلخیصاً عرض ہے کہ اسلام کی رو سے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اللہ ہے (یعنی توحید)۔ انسان اس کا عبد ہے جو اس سے محبت کرتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے اس کی پرستش اور اطاعت کرتا ہے (عبادت/ بندگی)۔ جو ایسا کرے وہ مسلم ہے۔ یہ پرستش اور اطاعت کیسے کرنی چاہیے؟ یہ بھی اللہ بتاتا ہے۔ دنیا میں ایک مسلمان کی آزمائش یہی ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق اس کی پرستش اور اطاعت کرتا ہے یا نہیں؟ اگر ایک مسلمان فرد یہ رویہ اختیار کرے تو دنیا میں اسے اطمینان قلب کی دولت ملتی ہے —— جو

دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے ــــــ اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی نعمتیں اور جنت اسے ملے گی۔ جہاں تک دنیا میں کامیابی، عزت و وقار اور قوت وغلبہ کا تعلق ہے تو اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ پورا معاشرہ عملاً مسلم بن جائے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارے۔ یوں ہر مسلم داعی ہے اور معروف کا حکم دینے والا اور منکرات سے روکنے والا ہے خاص طور پر وہ افراد جو اللہ کی ہدایات کا تفصیلی علم رکھتے ہوں یعنی عالم ہوں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود اس ہدایت پر عمل کریں بلکہ اس ہدایت کو لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں اس پر عمل کی ترغیب دیں۔ جب مسلمانوں کی حکومت ہو تو حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ ریاستی قوت سے اللہ کی ہدایت یعنی اس کے دین پر عمل کا ماحول بنائیں اور ترغیب وترہیب سے مسلمانوں سے اس پر عمل کرائیں اور اگر مسلمان حکمران اپنی اس ذمہ داری سے پہلوتہی کریں تو علماء کرام کا فرض ہے کہ ان کی تذکیر کریں، ان تک دین کی دعوت پہنچائیں اور انہیں ان کے فرائض یاد دلائیں۔

دینی تعلیمات کا جو خلاصہ ہم نے سطور بالا میں پیش کیا ہے، اس پر عمل کے حوالے سے اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو یہ نظر آتا ہے کہ علماء کرام پاکستانی معاشرے میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے، الحمدللہ، فعال ہیں اور کئی محاذوں پر سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں تا کہ برسر اقتدار آ کر ریاستی قوت کو اسلام پر عمل کے لیے ترغیب وترہیب کے طور پر استعمال کریں، کچھ مدارس میں علماء دین تیار کرتے اور مساجد میں عوام کو تعلیم دیتے ہیں اور کچھ دعوت واصلاح کے میدان میں کام کر رہے ہیں تا کہ عامۃ الناس تک دینی تعلیمات پہنچائیں تا کہ وہ ان پر عمل کریں۔ گویا پاکستانی علماء کرام ہمہ جہت کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کا ہر مسلمان اپنی انفرادی زندگی میں اچھا عملی مسلمان بن جائے اور اللہ کی عبادت اور اطاعت کا حق ادا کرنے لگے اور اسی طرح وہ اجتماعی زندگی میں تبدیلی لانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ پچھلے ۶۳ سال میں ان کی کوششوں کا حاصل کیا رہا ہے؟

اگر ہم معروضیت اور غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو صورت حال بہت حوصلہ افزا نظر نہیں آتی۔ مسلمان عوام کی اخلاقی حالت بہت پتلی ہے (جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی، حبّ مال و جاہ، حرص، ہوس، حسد، جھگڑے عام ہیں) معاملات میں بھی وہ اسلامی تعلیمات سے بہت دور ہیں (رشوت، فراڈ، کرپشن، دھوکہ دہی، اپنے حقوق ادا نہ کرنا، محنت سے بچنا، منظم نہ ہونا، ایثار سے کام نہ لینا، قانون کی پیروی نہ کرنا اور قیادت کی عدم اطاعت ہمارے عمومی معاشرتی رویے ہیں)، عبادات وغیرہ کی صورت حال بھی غیر تسلی بخش ہے (نماز بہت کم لوگ پڑھتے ہیں، قرآن بہت کم لوگ سمجھتے ہیں، زکوٰۃ

بھی سب لوگ نہیں دیتے۔۔۔) آخر اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟

دین کا ایک طالب ہونے کے ناطے جہاں تک ہم نے اس معاملے پر غور کیا ہے ہمیں اس کے دو بڑے سبب نظر آتے ہیں: ایک یہ کہ علماء کرام کا کام غیر مؤثر ہے اور نتائج پیدا نہیں کر رہا۔ دوسرے بگاڑ کی قوتیں زیادہ طاقتور ہیں اور جو تھوڑا بہت اصلاحی کام ہوتا اسے بہالے جاتی ہیں۔ آیئے ذرا ان باتوں کی تفصیل میں جائیں۔

علماء کرام کے غیر مؤثر ہونے کے اسباب

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ہمارے علماء کرام کی زیادہ تر سرگرمیاں تین دائروں میں محیط ہیں: ۱۔سیاست ۲۔تعلیم و تعلّم؛ اور ۳۔دعوت و اصلاح۔ اب اگر ہم علماء کرام کے غیر مؤثر ہونے کے اسباب وعوامل کی بات کرتے ہیں تو ان تینوں شعبوں کا الگ الگ جائزہ لینا پڑے گا:

سیاست

علماء کرام اور دینی عناصر کے سیاسی میدان میں غیر مؤثر ہونے کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ فرقہ واریت یعنی ہر دینی مسلک کے علماء کرام نے اپنی اپنی سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ فرقہ واریت پھیلتی ہے بلکہ یہ سیاسی ناکامی کا بھی تیر بہدف نسخہ ہے کیونکہ سیاسی جماعتیں جب دینی مسلک کی بنیاد پر بنیں گی تو ایک مسلک کے لوگ کبھی دوسرے مسلک کے قائدین کو ووٹ نہیں دیں گے یوں مسلک پر بنی کوئی دینی سیاسی جماعت کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہماری تحقیق کے مطابق اسلام دشمن بین الاقوامی قوتوں اور ان کے گماشتہ مقامی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں نے مسلک پر بنی سیاسی جماعتوں کے قیام کا کام پلاننگ سے کیا ہے اور اسے جاری رکھنا بھی ان کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔

۲۔ ہمارے عوام کا مزاج یہ ہے کہ ان کے نزدیک کامیاب سیاستدان وہ ہوتا ہے جو تھانے کچہری کے کاموں، سرکاری دفتروں میں تبادلے اور ملازمتوں کے حصول، گلیاں پختہ کروانے، سڑکیں بنوانے اور اسی طرح کے دیگر دینوی کاموں میں ان کی مدد کرے۔ دوسری طرف ہمارے علماء کرام تعلیم و تعلّم اور دعوت و اصلاح جیسے کاموں کے عادی ہیں اور ان کاموں میں عوامی چندے کے محتاج ہیں یعنی وہ عوام سے لینے کے عادی ہیں نہ کہ انہیں کچھ دینے اور ان پر خرچ کرنے کے۔ اس لیے عامۃ الناس کا رجحان یہ ہے کہ علماء کرام کا احترام اپنی جگہ لیکن سیاسی اقتدار کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں چنانچہ وہ دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ نہیں دیتے۔

۳۔ ہمارے انتخابی نظام میں کامیابی کے لیے پیسے، برادری اور قبیلے جیسے عوامل کا بے دریغ استعمال عام

ہے جب کہ ہمارے علماء کرام بالعموم دنیاوی وجاہت، دولت اور مادی وسائل سے محروم ہوتے ہیں۔
۴۔ ہمارے عوام کی اکثریت ان پڑھ اور غریب ہے اور وہ مندرجہ بالا منفی عوامل کے اثرات سے آزاد ہو کر اپنے ووٹ کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکتی۔
۵۔ پاکستان میں برسراقتدار کون آئے گا؟ ایسے اہم سیاسی فیصلے میں امریکہ و یورپ اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ظاہر ہے وہ کیوں چاہیں گے کہ دینی عناصر اور علماء کرام برسراقتدار آئیں اور اسلام نافذ کریں؟

تعلیم و تعلّم

تعلیم اس لیے اہم ہوتی ہے کہ وہ ذہن سازی اور کردار سازی کرتی ہے۔ علماء کرام اگر تعلیم کا صحیح استعمال کریں تو معاشرے میں اسلامی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا کیونکہ:
۱۔ ملک میں عمومی تعلیم کے نظام کے تحت جو کروڑوں بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت میں علماء کرام کا کوئی کردار نہیں اور نہ کبھی انہوں نے اسے اپنا ہدف بنایا ہے۔
۲۔ دینی مدارس کے نام سے جو تعلیمی ادارے علماء کرام چلا رہے ہیں ان کا پروگرام اور نصاب ایسا ہے کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات مساجد و مدارس میں کام کرنے کے سواء معاشرے میں نہ تو کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں اور نہ معاشرے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ عام آدمی کی تعلیم و تربیت کے لیے دینی مدارس کے پاس کوئی پروگرام ہے ہی نہیں۔ وہ محدود دینی مقاصد کے لیے صرف متخصص علماء تیار کرتے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے مسلک کے۔
۳۔ بدقسمتی سے بعض لوگوں نے دینی مدارس بنانے اور چلانے کو کاروبار بنا رکھا ہے۔
۴۔ علماء کرام کے پاس ہر محلے میں مسجد موجود ہے جو تعلیمی مرکز بن سکتی ہے لیکن وہ اس میں عموماً نماز کے علاوہ صرف ناظرہ قرآن پڑھاتے ہیں۔ عام تعلیم تو رہی ایک طرف وہ تو اس میں 'دینی تعلیم' بھی نہیں دیتے مثلاً قرآن حکیم کا ترجمہ بھی نہیں پڑھاتے کہ لوگوں کو سمجھ آجائے کہ اللہ کی کتاب میں لکھا کیا ہے؟

دعوت و اصلاح

وعظ و تبلیغ، دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر علماء کرام کا خصوصی دائرہ کار ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ کام بھی مؤثر انداز میں نہیں ہو رہا کیونکہ:
۱۔ ہر جماعت اور گروہ نے دعوت و تبلیغ کا اپنا ایک مخصوص اسلوب اور ڈھب بنا رکھا ہے اور ہر کوئی صرف اپنے اسلوب اور طریق کار ہی کو صحیح سمجھتا ہے۔

۲۔ بعض لوگوں نے دین کا کوئی ایک جزو یا کوئی ایک ترجیح سامنے رکھ لی ہے اور اسے کامل دین کہہ کر پیش کرتے ہیں۔

۳۔ اکثر واعظین کی گفتار کے پیچھے عمل اور کردار کی قوت نہیں ہوتی لہٰذا جو بات دل سے نہ نکلے وہ اثر نہیں رکھتی۔

۴۔ علماء کرام میں سے اکثر اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن اسے دین کی تبلیغ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جمعہ کے اکثر خطبے فرقہ واریت اور مسلک پرستی پر مبنی ہوتے ہیں اور ہمارے اکثر دینی مدارس دین کے نہیں اپنے اپنے مسلک کے مبلغ اور داعی تیار کرتے ہیں۔

۵۔ اکثر و بیشتر دعوت و تبلیغ میں عصر حاضر کے تقاضوں اور جدید تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگوں کی نفسیات اور طرز فکر کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا کیونکہ علماء کرام کی اکثریت نہ جدید تعلیمی اداروں میں حصول تعلیم کے لیے جاتی ہے اور نہ مغربی فکر و تہذیب پر مبنی نظام تعلیم کے اثرات کا گہرا ادراک رکھتی ہے۔

۶۔ فرد کی اصلاح کا کام تزکیے اور تصوف کے نام پر اکثر و بیشتر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔ سجادہ نشینی اکثر میرٹ کی بجائے وراثت پر مبنی ہوتی ہے جسے بعض لوگ کاروبار سمجھ کر چلاتے ہیں۔

یہ تھے وہ چند اہم عوامل جو علماء کرام کی دینی جدوجہد کو غیر مؤثر بناتے ہیں۔ اب آیئے دوسرے پہلو کی طرف کہ بگاڑ کی بعض قوتیں علماء کے تھوڑے بہت اصلاحی اثرات کو کس طرح غیر مؤثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں:

بگاڑ کی قوتوں کا قوی تر ہونا

مذکورہ بالا کمزوریوں کے باوجود ہماری دینی قیادت اور علماء کرام چونکہ فعال اور متحرک ہیں اور دین کے لیے محنت کر رہے ہیں (اور اس کے لیے وہ مستحق ثنا ہیں اور مخلصین کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے) اس لیے معاشرے پر ان کے مثبت اثرات موجود ہیں لیکن ایک بڑی قوت دنیا میں ایسی ہے جو اسلام دشمن ہے اور اسلامی اصول و اقدار اور اسلامی طرز حیات کا خاتمہ چاہتی ہے اور وہ اتنی طاقتور ہے اور اس کے وسائل اتنے زیادہ ہیں کہ وہ ہماری دینی قیادت☆ اور علماء کرام کے اصلاحی و تعمیری اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ بگاڑ کی اس ابلیسی قوت کا نام ہے مغربی فکر و تہذیب۔ چونکہ یہ تہذیب اِس وقت دنیا پر غالب ہے اور کئی صدیوں سے

☆ روایتی علماء کرام کے علاوہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور سول سوسائٹی کی قائم کردہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی چھوٹی بڑی تنظیمیں اور ادارے دین کے لیے کام کر رہے ہیں جن کے کرنے والے نہ روایتی علماء ہیں اور نہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں، اس لیے ہم علماء کرام کے علاوہ 'دینی قیادت' کی اصطلاح بھی استعمال کر رہے ہیں۔

غالب ہے اور مسلمان اس سے شکست کھا چکے ہیں اور اب سنبھلنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کررہے ہیں اس لیے اس ابلیسی فکر وتہذیب کی علمبردار قوتوں (سپر پاور امریکہ و یورپ اور اس کے حلیف بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ) کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان اسلام پر عمل نہ کریں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی چیز مسلمانوں کی قوت کا منبع ہے۔ اس لیے یہ لوگ پوری کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کے علماء کرام اور دینی عناصر کو ناکام کریں اور معاشرے پر ان کے تعمیری اور صحت مند اثرات کو زائل کریں۔

اِن اسلام دشمن عالمی قوتوں کے پاس وسیع وسائل و ذرائع ہیں لیکن ان کی ہوشیاری اور چالاکی یہ ہے کہ اس کام کے لیے وہ ہمارے ہی وسائل و ذرائع ہمارے خلاف استعمال کررہے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے ہماری سیاسی قیادت کو قابو کیا ہوا ہے اور یوں وہ مسلمان ریاست اور اس کے اداروں کی ساری قوت فساد اور بگاڑ کے فروغ اور اسلامی اصول واقدار اور طرز حیات کی بیخ کنی کے لیے استعمال کررہی ہیں۔ اس بگاڑ کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیم اور میڈیا ہیں جو ذہن سازی کرتے اور تعمیر شخصیت میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا یہ قوتیں سعی کرتی ہیں کہ تعلیم اور میڈیا کے ذریعے مسلمانوں خصوصاً ان کی نئی نسل اور نوجوانوں کے اخلاق بگڑ جائیں تاکہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر اسلامی اصولوں پر نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہماری معاشی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں تاکہ ہم مفلس و قلاش رہیں، دال روٹی کے چکر سے نہ نکل سکیں اور کبھی پیٹ سے آگے نہ سوچ سکیں۔ وہ ہمارے ہاں امن وامان بھی قائم نہیں ہونے دیتے اور عدل وانصاف بھی مہیا نہیں ہونے دیتے تاکہ ہماری زندگی عذاب بنی رہے اور مسلم معاشرے امن وسکون اور خیر وفلاح کی طرف نہ بڑھ سکیں۔ یہ ہیں وہ حالات جو اس وقت ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں۔

دعوت و اصلاح کی حکمت عملی منصوص نہیں ہوتی

پاکستانی معاشرے کے حالات کا جو تجزیہ ہم نے سطور بالا میں کیا ہے اس کی روشنی میں اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال پر ہماری دینی قیادت اور علماء کرام کا ردعمل اور اصلاح کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ ان کی موجودہ کوششیں غیر مؤثر اور ناکافی ثابت ہوئی ہیں۔ وہ جس اسلوب اور منہج سے کام کررہے ہیں ان کا ناکافی اور غیر مؤثر ہونا ثابت ہو چکا ہے لہٰذا ہمیں دعوت واصلاح کی نئی حکمت عملی درکار ہے، ایک نئے منہج کی ضرورت ہے اور علماء کرام سے زیادہ کون جانتا ہے کہ دعوتی حکمت عملی منصوص نہیں ہوتی۔ منصوص تو کار دعوت ہوتا ہے، حکمت عملی ہمیشہ اجتہادی ہوتی ہے کہ اس کا تعلق تدبیر سے ہوتا ہے لہٰذا یہ بدل سکتی ہے بلکہ حالات کے بدل جانے سے اسے لازماً بدل جانا چاہیے کہ اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ **الحکم یدور مع العلۃ** یعنی حالات بدلیں گے تو حکم

بدل جائے گا۔ اس لیے دین کے ابلاغ اور اس پر عمل کی جدوجہد کے موجودہ مناہج اگر مؤثر نہیں رہے تو کوئی نیا منہج اختیار کرنے میں کیا شرعی قباحت ہے؟

حل کیا ہے؟

ہماری طالب علمانہ رائے میں علماء کرام کی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کی نئی پالیسی مندرجہ ذیل اسالیب اور خصوصیات کی حامل ہونی چاہیے تاکہ فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیرِ اخلاق اور انسان سازی کا کام مؤثر انداز میں ہو سکے:

تعلیم وتربیت

تعلیم وتربیت اس مجوزہ اسکیم کی جان ہے اور بلاشبہ تعلیم کی کثرت بھی مطلوب ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور زیادہ سے زیادہ افراد کی تربیت کی جائے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اور ناگزیر ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے کیونکہ ہمارے موجودہ نظام میں جدید تعلیم حقیقی اسلامی تعلیم وتربیت کے تقاضے پورے نہیں کرتی بلکہ مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے کی وجہ سے اپنے غیر اسلامی سٹرکچر اور مزاج کی وجہ سے بگاڑ کا سبب بن رہی ہے؛ جبکہ دینی مدارس کا نظام تعلیم بھی اصلاح ونظر ثانی کا محتاج ہے کیونکہ یہ مسلم معاشرے اور ریاست کی عصری ضروریات پوری نہیں کرتا اور تعلیم دینی و دنیاوی دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہے اور یہ امر خود خلاف اسلام ہے کیونکہ، جیسا کہ علماء کرام جانتے ہیں کہ، اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق وتقسیم نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی علماء کرام کے علم میں ہے کہ پہلی بارہ صدیوں تک مسلمانوں کا نظام تعلیم موحد تھا یعنی ایک ہی نظام تعلیم تھا جو دین کے متخصص علماء تیار کرتا تھا تو اس کے ساتھ ایسے افراد بھی تیار کرتا تھا جو معاشرے کے مفید کارکن ہوتے تھے اور ریاست کا نظام بھی چلاتے تھے۔ یہ تو ہندوستان میں مسلمان حکومت ختم ہو جانے کے بعد ہوا کہ علماء کرام حالات کے جبر کے تحت ایسے مدارس قائم کرنے پر مجبور ہو گئے جن میں مسلمانوں کی دینوی تعلیم کا انتظام وہ نہ کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے یہ مجبوری قیام پاکستان کے بعد ختم ہو گئی اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ تعلیمی ثنویت ختم کر دی جائے اور دینی و دنیاوی تعلیم کو باہم مربوط کر دیا جائے۔

اگر جذباتیت سے ہٹ کر اور ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو یہ بالکل ممکن ہے کیونکہ علماء کرام کے دینی مدارس اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کے جدید تعلیم کے ہزاروں، سکول کالج اِس وقت پرائیویٹ سیکٹر میں کام کر رہے ہیں لہٰذا اگر حکومتِ پاکستان وحدت و اصلاح تعلیم کا یہ کام نہ بھی کرے تو علماء کرام، دینی عناصر اور سول سوسائٹی کے صالح عناصر مل بیٹھ کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ جدید

اور عمومی تعلیم ایسی ہوگی کہ وہ اسلامی تقاضے پورے کرے اور مغربیت کو رد کردے؛ اور دینی تعلیم ایسی ہو کہ وہ جدید علوم کا بھی احاطہ کرے۔ مثلاً پرائمری تک کی تعلیم سب کے لیے ایک جیسی ہو جس میں اسلام تو ہو لیکن مغربیت نہ ہو۔ پھر چھٹی جماعت سے ۷۰،۸۰ فیصد تعلیم مشترکہ ہو اور ۳۰،۲۰ فیصد اختیاری ہو جس میں سائنس، آرٹس، کامرس کے ساتھ مذہبی تعلیم کا تخصص بھی ہو۔ میٹرک کے بعد مذہبی تعلیم کا تخصص مدارس کے پاس چلا جائے جس میں ۸۰،۷۰ فیصد مذہبی مضامین ہوں اور ۳۰،۲۰ فیصد عمرانی وسائنسی علوم ہوں۔ ڈگریاں دونوں کی حکومت سے منظور شدہ ہوں۔ نیا بورڈ بھی بنایا جاسکتا ہے اور حکومت سے منظور کرایا جاسکتا ہے (اگر اصلاح تعلیم کے پیچھے ایک مضبوط تحریک ہو تو یہ زیادہ مشکل نہیں) اور عارضی طور پر موجودہ بورڈوں اور یونیورسٹیوں سے بھی کام چلایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی تخصص والے لوگ ایم اے کی سطح پر عمرانی علوم میں چلے جائیں۔ ہم اِس مضمون میں یہاں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے ورنہ ہم نے ان باتوں پر برسوں غور کیا ہے اور ان مشکلات کا حل پیش کیا ہے جو ہماری کتابوں اور ماہنامہ البرہان کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے☆

خلاصہ یہ کہ جدید تعلیم والے (سکول تا یونیورسٹی) یہ طے کرلیں کہ تعلیم میں اسلامی عنصر لانا ہے اور مغرب کی تقلید چھوڑنی ہے اور دینی مدارس یہ طے کرلیں کہ انہوں نے دینی تعلیم اس طرح دینی ہے کہ ان کے فضلاء جدید علوم سے بھی بخوبی واقف ہوں تاکہ اسلام معاشرے اور ریاست میں زندہ قوت بن سکے۔ دینی علوم پر نظر ثانی کی کس طرح ضرورت ہے اس کی ہم صرف ایک مثال دیتے ہیں کہ فقہ و اصول فقہ میں جہاں ہدایہ اور مسلم الثبوت وغیرہ پڑھانا ضروری ہیں وہیں حنفی فقہ کے ساتھ دیگر مکاتب فکر کا تقابلی مطالعہ بھی اہم ہے اور جدید اصول قانون بھی پڑھانے چاہئیں۔ پاکستانی آئین وقوانین اور مغرب و اقوام متحدہ کے قوانین سے واقفیت بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے ان کے لیے انگریزی زبان پر عبور بھی ہونا چاہیے۔ اصول اجتہاد پڑھانے کے بعد معاشرے کے جدید مسائل پر ان کی تطبیق کی مشق بھی ناگزیر ہے۔۔۔ وقِس علی ذلک۔

اور تعلیم سے زیادہ اس کا حاصل اور نتیجہ اہم تر ہے جسے تربیت وتزکیہ کہا جاتا ہے یعنی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسی شخصیت پروان چڑھے جو اپنی عملی زندگی میں مسلمان ہو۔ اسی طرح نسل نو کے ساتھ ساتھ بڑوں (grown ups) کی تربیت وتزکیہ کے لیے بھی منظم کام کرنے کی ضرورت ہے۔

میڈیا

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا آج کی زندگی میں ذہن سازی اور شخصیت سازی میں اہم کردار

☆ تفصیلات کے لیے مکتبہ البرہان سے رابطہ فرمائیں

ادا کرتا ہے لیکن علماء کرام اور دینی عناصر ابھی تک ان کو دعوت و اصلاح کے لیے استعمال کرنے پر یکسو نہیں ہوسکے حالانکہ اشاعت اسلام کے لیے ثقافتی سرگرمیوں اور کھیلوں میں شرکت کی جڑیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں موجود ہیں☆ ہم نے اس غرض سے ۲۰۰۹ء میں لاہور میں ملی مجلس شرعی کے تحت سارے مسالک کے علماء کرام کا ایک اجلاس بلایا۔ سب علماء کرام نے دن بھر کے غور وخوض کے بعد اسلامی مقاصد کے لیے موجودہ الیکٹرانک میڈیا کے استعمال اور اس میں شمولیت کے حق میں رائے دی۔ سلفی حضرات میں سے مولانا عبدالعزیز علوی صاحب (جامعہ سلفیہ فیصل آباد) اور دارالسلام لاہور کے مولانا صلاح الدین یوسف صاحب مخالفت کرتے رہے لیکن بحث ومناقشے کے نتیجے میں بالآخر شام کے وقت انہوں نے بھی بکراہت دفاع اسلام کے لیے الیکٹرانک میڈیا کے استعمال کی اجازت دے دی۔ تصویر کی حرمت کے سب قائل تھے (اگرچہ بعض مفتی حضرات نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے عکس اور شبیہ پر اس 'تصویر' کا اطلاق نہیں ہوتا جو شرعاً ممنوع ہے) لیکن سدّ الذریعہ اور جلب المصلحہ کے پیش نظر انہوں نے الیکٹرانک میڈیا میں علماء کرام کی شرکت اور عام مسلمانوں کو اسے دیکھنے کی اجازت دی۔

اس کے باوجود علماء کرام اور دینی عناصر ابھی تک میڈیا کے میدان میں حقیقی معنوں میں نہیں اترے۔ اور جو اترے ہیں وہ فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو شعار بنا کر مزید بگاڑ کا سبب بنے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا کو منکرات اور بُرائی کا علمبردار بننے کی مزاحمت کی جائے اور اس سے اشاعت معروف وخیر کا کام لیا جائے اور ان دونوں کاموں کے لیے سخت محنت اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا میڈیا مغرب کے کنٹرول میں ہے۔ امریکہ و یورپ (اور بھارت) ہمارے میڈیا کو خریدنے، لبھانے اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر بہت وسائل خرچ کرتے ہیں۔ ہماری حکومتیں مغرب کا گماشتہ ہونے کی وجہ سے یہ سب ہوتے دیکھتی رہتی ہیں اور کوئی ایکشن نہیں لیتیں۔ دینی قوتوں کو چاہیے کہ وہ اسلام دوست اور محبت وطن عناصر کی حمایت سے اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں اور حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مطابق ایک مضبوط ثقافتی پالیسی وضع کرنے اور اسے سختی سے نافذ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ علاوہ ازیں دینی عناصر کو چاہیے کہ صحافیوں کی اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والی پیشہ ورانہ تنظیمیں بنوائیں۔ علماء اور پروفیشنلز کی تربیت کے لیے تعلیمی و تربیتی ادارے بنائے

☆ عکاظ کے میلے میں شرکت، شعر وادب کے مقابلے میں سورہ الکوثر کو پیش کرنا اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو میدان میں اتارنا، اور کشتی لڑ کر بلکہ اس میں ہرا کر ایک کافر کو مسلمان کرنا اس کی چند مثالیں ہیں)۔

جائیں۔اسلامی ثقافتی پالیسی اور ضابطہ اخلاق بنایاجانا چاہیے۔میڈیا عدالت قائم کی جانی چاہیے ۔ میڈیا پروگراموں کی نگرانی کے لیےعوامی کمیٹیاں بننی چاہئیں۔اسلامی تناظر میں پروگرام تیارکرنے کے لیے ادارے اور ٹی وی چینلز کھولنے چاہئیں۔ جو ٹی وی چینلز امریکی و بھارتی تقلید نہ چھوڑیں ان کے خلاف رائے عامہ ابھارنی چاہیے اوران کے خلاف عوامی ریلیاں منظم کرنی چاہئیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

تعمیراخلاق

اہل دانش جانتے ہیں کہ افراداور اقوام کی بقاء و استحکام اورعروج و زوال کا انحصار ان کے اخلاق پر ہوتا ہے۔ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۹۴ء کا جو سال ہم نے (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) اسلام آباد میں گزارا تو وہاں ہماری ملاقات شیخ الحدیث مولانا عبدالغفارعمر پوریؒ سے بھی ہوئی۔ انہوں نے راقم میں جو کچھ تڑپ ملت کی اصلاح کے لیے دیکھی تو بار بار کہتے تھے کہ پاکستان میں اصلاح اخلاق کی تحریک چلانی چاہیے اور جب میں نے اس ضمن میں کچھ عملی پیش رفت کی کوشش کی تو وہ باوجود شدید بیماری اورضعف کے اس میں پیش پیش تھے۔

تعمیر اخلاق کی ایک صورت یہ ہے کہ علماء کرام سول سوسائٹی کومتحرک کریں کہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت متحد ومنظم ہو اور اپنے اخلاقی حالات بہتر بنائے۔اس غرض سےعوام کو محلے کی سطح پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے ہر محلے میں الحمدللہ مسجد ہوتی ہے اور اس میں مسلمان جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے دن میں پانچ بار جمع ہوتے ہیں لہٰذا تنظیم کے لیے افراد بھی موجود ہیں، جگہ بھی اور امام صاحب کی صورت میں ایک لیڈر بھی لہٰذا منظم ہونا اتنا مشکل بھی نہیں۔بس یہ دیکھ لیا جائے کہ اس میں محلے کی سطح کے معززین اور ہرمکتب فکر اور طبقے کا آدمی موجود ہو تا کہ ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔محلے کی سطح پر بننے والی اس کمیٹی کو جو کام کرنے چاہئیں ان میں سے اولین اہمیت کا کام تعمیر اخلاق کا ہے کیونکہ وہ معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا جس کی اخلاقی اقدارختم ہوجائیں۔ اس کمیٹی کو چاہیے کہ محلے کی سطح پر عوام خصوصاً نوجوانوں اور بچوں کی تعمیر اخلاق کے پروگرام وضع کرے۔ مقامی سکول، کمیونٹی سنٹر، مسجد، سرکاری دفتر یا کسی بھی کھلے گھر کو اس کام کے لیے بطور مرکز استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کے کوئز پروگرام، نوجوانوں کے لیے کھیل، خصوصی ایام (جیسے یوم پاکستان، اقبال ڈے، شب معراج وغیرہ) پر تقاریب، اِن ڈور گیمز، فری ٹیوشن سنٹرز، شعری اور تقریری مقابلے، ترجمۂ قرآن کلاس۔۔۔کی طرح کے پروگرام منظم کیے جاسکتے ہیں۔کمیٹی دیکھے کہ محلے کے غیر مہذب نوجوان گلی کی نکڑ پر کھڑے ہوکر یا پارک وغیرہ میں جمع ہوکر غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوں۔ یہ کمیٹی اگر اپنی مدد آپ کے تحت تعلیمی اداروں میں داخلے، گلیوں کی صفائی، گٹر

اُبلنے، روشنی کا انتظام، بیماروں کو ہسپتال لے جانے یتیموں، بیواؤں کی مدد جیسے کام بھی کرنے لگے تو معاشرتی زندگی بہت خوبصورت اور سکون بخش ہو سکتی ہے۔

خدمت خلق

دعوت و اصلاح کی نئی حکمت عملی کے تین پہلوؤں (تعلیم، میڈیا اور تعمیر اخلاق) پر گفتگو کے بعد اب ہم عرض کریں گے کہ ہمارے علماء کرام اور دینی عناصر کو ایک کام اور کرنا چاہیے اور وہ ہے خدمت خلق یعنی کسی وجہ سے معاشی اور معاشرتی زندگی میں پیچھے رہ جانے والوں کی دستگیری اور ان کے دکھوں اور مشکلات کو کم کرنے کی سعی کرنا۔ ممکن ہے بعض علماء کرام کو ہماری یہ تجویز نامانوس یا غیر معقول لگے لہٰذا ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ یہ کام جسے ہم نے خدمت خلق اور عوام کے دکھوں میں ہاتھ بٹانے کا نام دیا ہے عین حکم شرعی ہے۔ قرآن حکیم اس سے بھرا پڑا ہے: ''**وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا** '' (الدھر ۸:۷۶) ۔ ''**وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ** (الذاریات ۱۹:۵۱) ۔ **اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِO فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَO وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (الماعون ۱۰۷:۱۔۳) اور اس سے غفلت کی مذمت فرمائی: ''**كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَO وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (الفجر ۸۹:۱۷،۱۸) اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''**من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته، ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة**''۔ (متفق علیہ)

اور اسوۂ حسنہ اس سے بھرا پڑا ہے۔ پہلی وحی پر جب آپ ﷺ گھبرائے تو حضرت خدیجہؓ نے کیا کہا تھا؟ حلف الفضول میں آپ ﷺ نے شرکت کیوں فرمائی؟ ابو جہل سے مظلوم کو حق کیوں کر دلوایا تھا؟ آپ ﷺ سائل کو کیوں خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے؟ یہاں تک کہ قرض لے کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے۔۔۔ **وغیر ذلک کثیرا** اور صحابہ کرامؓ کا طریقہ کیا تھا؟ حضرت عمرؓ ایک بیوہ کی بکری دوہنے جاتے تھے لیکن کوئی ان سے سبقت لے جاتا تھا۔ ایک دن کوشش کر کے جلدی گئے کہ دیکھیں وہ کون ہے تو وہاں امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ کو پایا۔ کیا یہ محض قصے کہانیاں اور وعظ کی باتیں ہیں اور ان پر عمل کی ضرورت نہیں؟

۲۔ علماء کرام نے کیوں یہ قبول کر لیا ہے کہ وہ معاشرے سے محض 'لینے والے' ہیں 'دینے والے' نہیں۔ ختم المرسلین ﷺ نے کیا فرمایا تھا کہ کون سا ہاتھ بہتر ہے، اوپر والا یا نیچے والا؟ معاف کیجیے گا۔ مسجد کے اماموں کو دیہات میں 'کمیں' سمجھا جاتا ہے اور زمیندار دوسرے کمیوں کے ساتھ ان کا

بھی حصہ نکالتا ہے اور بعض جگہ تو بیچارے امام صاحب بال بچے کا پیٹ پالنے کے لیے گھر گھر سے روٹی اکٹھی کر کے لاتے ہیں اور شہروں میں بھی امام اور خطیب مسجد کمیٹی کے معمولی تنخواہ پانے والے ملازم ہوتے ہیں۔ اہل مدارس جب چندہ اکٹھے کرنے نکلتے ہیں اور صنعت کاروں اور تاجروں کے پاس جاتے ہیں تو وہ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟ یہ تلخ حقائق ہیں جن کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے؟

۳۔ کیا مدرسے میں تدریس کا مطلب یہ ہے کہ عوامی زندگی نہ گزاری جائے؟ عوام کے دکھ درد میں شریک نہ ہوا جائے؟ لوگ نماز پڑھنے مسجد نہ آئیں تو امام صاحب تڑپ اٹھیں لیکن محلے میں ایک یتیم بچہ بھوک سے مر رہا ہو تو امام صاحب کو خبر ہی نہ ہو؟ محلے میں کوئی آدمی فوت ہو جائے تو امام صاحب پارک میں نماز پڑھاتے ہیں کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے اور اس میں ثواب دارین ہے لیکن اسی پارک میں محلے کے لڑکے اکٹھے ہو کر چرس پیتے ہوں اور خرافات بکتے ہوں تو انہیں روکنا کیا مولوی صاحب کا دردِ سر نہیں؟ اور اس کا کوئی ثواب نہیں؟

۴۔ اشاعت اسلام میں علماء سے زیادہ صوفیاء کا کردار کیوں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، محض 'لینے والے' نہیں 'دینے والے' بھی تھے۔ لوگ جب خانقاہ میں جاتے تو انہیں فری کھانا ملتا تھا، فری رہائش ملتی تھی۔ صوفیا عوامی زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ اور امراء ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ لینے سے انکار کرتے تھے۔ وہ غریبوں، مسکینوں کو سینے سے لگاتے تھے، ان کے کام آتے تھے۔ کیا اس میں علماء کرام کے لیے کوئی سبق نہیں؟

خدمت خلق اور عوام کے دکھ درد بانٹنے کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ ہم بطور مثال دینی عناصر اور علماء کرام کے لیے خدمت خلق کی مندرجہ ذیل تین سرگرمیاں تجویز کرتے ہیں:

غربت کا علاج

جو لوگ بھوک سے خودکشیاں کرتے ہیں آخر وہ کسی بستی، کسی محلے میں ہی رہتے ہوں گے اور کون سی بستی اور محلہ ہے جہاں مسجد نہ ہو اور کون سی مسجد ہے جہاں امام نہ ہو۔ لہٰذا اگر امام صاحب متحرک ہو جائیں اور محلے کے نمازیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دیں تو محلے کی سطح پر یہ جاننا قطعاً مشکل نہیں کہ کون بیوہ ہے، کون یتیم ہے، کون بے روزگار اور مالی مشکلات میں گرفتار ہے۔ ان مستحقین کی فہرست بن جائے اور پھر ایک فہرست محلے کے کھاتے پیتے لوگوں کی بن جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے اگر ہر کھاتا پیتا گھرانہ زیادہ نہیں، تھوڑا سا ایثار بھی کرے اور مستقل کرے (مثلاً ۱۰۰ روپے ماہانہ) تو کافی رقم جمع ہو سکتی ہے اور محلے کے غرباء و مساکین کی مدد ہو سکتی ہے یہ

بات بظاہر سادہ اور ہلکی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس پر عمل ہوجائے تو معاشرہ جنت بن سکتا ہے۔اس کے لیے کئی تجاویز اور بھی ہوسکتی ہیں خصوصاً یہ کہ ملک کے ٹاپ کے علماء کرام جمع ہوکر قومی سطح کی ایک مرکزی زکوٰۃ کونسل قائم کردیں اور اس کی انتظامیہ میں ایسے لوگ شامل کریں جن کی دیانت و امانت پر عوام کو اعتماد ہو تو سارے لوگ اپنی زکوٰۃ و عطیات اس کونسل کو جمع کرائیں۔ اس طرح کروڑوں اور اربوں روپیہ جمع ہوسکتا ہے جو معاشرے سے غربت ختم کرنے پر خرچ کیا سکتا ہے۔

قیام امن و امان

مسجد کے امام صاحب نمازیوں پر مشتمل محلے کی ایک امن کمیٹی تشکیل دے دیں جو نوجوانوں کو منظم کرے اور نوجوان باری باری گھنٹے دو کے لیے رات کو جاگ کر پہرہ دیا کریں تو اہل محلہ کو چوری ڈاکے سے نجات مل سکتی ہے۔اگر اس امن کمیٹی کے ارکان دن میں بھی آنے جانے والوں پر نظر رکھیں تو لوگ سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اہل محلہ کو منظم کرکے سیکورٹی گارڈز بھی رکھے جاسکتے ہیں جن کا زیادہ مالی بوجھ بھی نہیں پڑے گا کیونکہ اگر محلے کے سب لوگ حصہ ڈالیں تو معمولی حصہ ڈالنے سے بھی کافی رقم اکٹھی ہوجائے گی کیونکہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

فراہمیٔ عدل و انصاف

جس چیز نے ہمارے معاشرے کو بے سکون کر رکھا ہے اس کی ایک وجہ انصاف کا نہ ملنا بھی ہے۔ عدالتیں فیصلے تاخیر سے کرتی ہیں، وکیلوں کی فیسیں ہوش ربا ہیں اور عام آدمی عدالتوں میں جا کر رُل جاتا ہے۔ دیوانی عدالتیں تو آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہیں لیکن سائلین کو انصاف نہیں ملتا۔ سستا اور فوری انصاف ایک ایسا نعرہ ہے جسے ہر سیاسی جماعت اپنے منشور میں شامل کرتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو پاتا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ ہمارے آئین و قانون میں مصالحتی و ثالثی عدالتوں کا تصور موجود ہے۔ اگر یہ عدالتیں اسلامی تناظر میں کام کریں تو انہیں 'شرعی عدالتیں' بھی کہا جاسکتا ہے۔ اگر امام صاحب متحرک ہوجائیں تو محلے کی سطح پر ایک شرعی/مصالحتی عدالت قائم کی جاسکتی ہے جس میں امام یا خطیب صاحب کے ساتھ کوئی نیک نام وکیل اور ایک موزوں و متدین حاضر سروس یا ریٹائرڈ پروفیسر/ ٹیچر/ اعلیٰ سرکاری ملازم یا تاجر بھی شامل کیا جاسکتا ہے یہ تین آدمیوں کی مصالحتی عدالت بن جائے اور محلے کے چھوٹے موٹے جھگڑے اس کے پاس آنا شروع ہوجائیں تو بظاہر دیکھنے میں یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے لیکن اس طرح کی عدالتیں اگر سارے ملک میں قائم ہوجائیں اور ان عدالتوں میں کوئی فیس،

خرچہ اورغیر ضروری تاخیر نہ ہوتو تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے معاشرتی زندگی کتنی خوشگوار ہوجائے گی، عدالتوں پر بوجھ کم ہوگا اور لوگوں کوسستا اورفوری انصاف ان کی دہلیز پر ملنے لگے گا۔شہر کی سطح پر ایک عدالت اپیل بھی بنائی جاسکتی ہے۔

علماء کرام اوردینی عناصر کا کردار

دعوت و اصلاح اور خدمت خلق کے جن کاموں کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے انہیں کرنے کی تحریک اگر علماء کرام چلائیں توان ساری سرگرمیوں کا تناظر اسلامی رہے گا لہٰذا علماء کرام کواس تحریک کی قیادت کرنی چاہیے۔ظاہر ہے اگر یہ مجوزہ کام ہونے لگیں تو آدھی سے زیادہ شریعت توخود بخود نافذ ہوجائے گی ۔ہم ان علماء کرام سے خصوصاً یہ کہنا چاہتے ہیں جو سیاست میں نہیں ہیں کہ کیا یہ ان کی خواہش نہیں ہے اور کیا یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اپنی زندگیوں میں اسلام پر عمل کریں؟ کیا وہ نہیں چاہتے کہ ملک میں شریعت نافذ ہو؟ تو اس کے لیے وہ کیا کررہے ہیں؟ اگر وہ کہیں کہ ہم مدارس میں لوگوں کو دین سکھاتے ہیں یا مسجدوں میں وعظ کرتے ہیں اور نمازیں پڑھاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ کام تو وہ پاکستان میں پچھلے ۶۳ سال سے کررہے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ کیا وقت نہیں آ گیا کہ وہ سوچیں کہ مسلمانوں کو اچھا اور حقیقی مسلمان بنانے اور انہیں شریعت پر عمل کے قابل بنانے کے لیے کچھ مزید کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ جو کچھ مزید کرنے کی ضرورت ہے وہ کیا ہو؟ اسی سوال کا جواب دینے کی سطور بالا میں کوشش کی گئی ہے۔

ہم ان دینی عناصر اور علماء کرام سے بھی جو سیاسی جدوجہد کررہے ہیں عرض کرتے ہیں کہ جس مجوزہ تحریک کی بات ہم کررہے ہیں اگرچہ وہ غیر سیاسی ہے لیکن اس طرح کی سماجی تبدیلی لانے والی تحریک اگردس بیس برس کامیابی سے چل جائے تو پاکستان میں سیاسی لحاظ سے بھی اسلام کے حق میں انقلاب آجائے گا اور جو دینی سیاسی جماعت اس سماجی تحریک میں فعال ہوگی اسے لوگ ووٹ دے کر بھی کامیاب کردیں گے جیسا کہ ترکی میں ہوا ہے۔ کاش دینی سیاسی لوگ اس بات کو سمجھیں اور اس طرح کی تحریک باہم مل کر چلائیں، اتحاد و اتفاق شرط ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

ہم علماء کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری مذکورہ بالا معروضات اور تجاویز پر سنجیدگی سے غورفرمائیں اور مجوزہ غیر سیاسی تحریک چلانے کے لیے قیادت مہیا فرمائیں۔

پروفیسر رشید احمد انگوی☆

تذکرہ چند دینی جرائد اور اکابر کا

نگاہ بستر کے ساتھ رکھی چھوٹی سی میز پر پڑی تو پانچ رسالے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے ناموں میں ایک عجب مناسبت دکھائی دی۔ اس پر غور کیا تو اللہ کریم کا فرمان یاد آیا جو اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے سورہ والضحیٰ میں فرمایا کہ ''اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کیا کیجیے''۔ معاً اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان رسائل و جرائد کے مندرجات سے بڑھ کر ان کے ساتھ وابستہ دینی، علمی وفکری شخصیات کا سامنے رہنا بذات خود راہ نمائی کا ذریعہ ہے۔ جی چاہا کہ ان جرائد کے تاریخی پس منظر میں جو ہستیاں جلوہ فرما ہیں ان کا مختصر سا تذکرہ ہوجائے۔ مگر یہ جرائد ہیں کون سے اور ان میں خاص مماثلت کیا ہے؟ تو یہ دینی وعلمی جرائد ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا نام ال سے شروع ہوتا اور ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ یوں یہ ایک ''گلدستۂ انوار'' ہے جس کا ہر پھول اپنے رنگ و بو کی مہک سے ماحول کو خوشگوار بنا رہا ہے۔۔۔ان جرائد کے نام ملاحظہ فرمائیں:

★الجامعہ ★الحسن ★الحق ★الامداد ★البرھان

الجامعہ: جامعہ محمدی (ضلع جھنگ) کے بانی مولانا محمد ذاکرؒ کا جاری کردہ رسالہ جس کا نام سامنے آتے ہی مولانا مرحوم کی ذات اور سیرت و اعمال کا روشن باب نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے۔ مولانا محمد ذاکرؒ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری و باطنی حسن و کمال اور انسانیت کی محبت، ہمدردی و غم گساری اور خیر خواہی کا مرقع بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ ان کی ہستی کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا اور رشک ملائکہ انسانی وجود کا نظارہ ہوتا تھا۔ چنیوٹ اور جھنگ کے درمیان کچی سڑک پر واقع بھوانہ کے گردونواح میں، دریائے چناب کے دلدلی ساحلی علاقے کے جغرافیہ میں جلوہ افروز مگر اسلامی دنیا کے شرق و غرب سے اس طرح مربوط کہ

☆ ڈائریکٹر الخلیل ریسرچ سنٹر 16-G مرغزار لاہور

عالم اسلام کی برگزیدہ شخصیات سے ذاتی روابط۔ اگر کوئی محقق اس عنوان پر تحقیق کرے کہ مولانا ذاکرؒ کی حیات مبارکہ کے دوران کن کن شخصیات نے جامعہ کا دورہ کیا تو حیرت انگیز فہرست تیار ہوجائے گی اور ان مہمانانِ ذی وقار کو دعوت دینے والے مردقلندر کی فکری بلندی کا اندازہ ہوسکے گا کہ وہ جامعہ کے طلبہ و اساتذہ کو کن راہوں پر چلانا چاہتے تھے۔ مولانا ذاکرؒ کے دست راست اور چھوٹے بھائی مولانا محمد نافع مدّظلہ نہ صرف بلند پایہ عالم بلکہ اعلیٰ ترین سطح کے محققین میں سے ہیں۔ ان کا تخصص دورصحابہؓ کے مطالعہ وتحقیق سے وابستہ ہے۔ راقم نے اپنے کسی مضمون میں انہیں سرزمین پنجاب کا ''ڈاکٹر حمید اللہ'' قرار دیا تھا جو دراصل ان کی شخصیت کے تعارف کے لیے تمثیل کا درجہ رکھتا ہے۔

مولانا محمد ذاکرؒ دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور بعد میں بھی ایک سے زائد بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ روحانی طور پر سلسلہ چشتیہ سے منسلک اور خانقاہ سیال شریف سے وابستہ تھے۔ حصول علم کے دوران وہ کچھ عرصہ کے لیے دارالعلوم دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی ذات مذہبی و گروہی تعصّبات سے بلند تھی اور وہ امت مسلمہ کے اتحاد کے عظیم الشان علم بردار تھے۔۔۔ میرے والد محترم شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد خلیلؒ (شاگرد عزیز علامہ انورشاہ کشمیریؒ) دو بار جامعہ محمدی میں بطور شیخ الجامعہ قیام پذیر رہے اور راقم نے جامعہ کے باقاعدہ طالب علم کے طور پر خود والد گرامی قدر سے صَرف ونحو کی مکمل تعلیم حاصل کی اور فقہ ومنطق اور علم الکلام کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔۔۔ میرا دور قیام میرے سکول کی کلاس ہفتم تانہم (61-1958ء) کا تھا۔ جامعہ محمدی کے سرچشمہ علم وتربیت سے جو فیض پایا عمر گزرنے کے ساتھ اس کا شعور واحساس بڑھتا جارہا ہے اور مولانا محمد ذاکرؒ کی عظمت ہر گزرتے دن کے ساتھ دل میں گہرے نقوش ثبت کرتی جاتی ہے۔ زندگی میں بہت سے لوگ دیکھے مگر مولانا محمد ذاکرؒ جیسی جامع الصفات شخصیت کی مثل کسی اور کو نہ دیکھا۔۔۔ الجامعہ کا پرچہ سامنے آتا ہے تو جیسے مولانا کی زیارت ہورہی ہو۔ ہمارے دور قیام جامعہ محمدی میں پرچہ پرانی روایت کے نسبتاً چھوٹے صفحات پر مشتمل ہوتا اور اس کے ایڈیٹر جناب عبدالحق جامعی ہوا کرتے تھے۔

الحسن: جریدے کا نام جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ امرتسری ثم لاہوری کے نام پر رکھا گیا۔ حضرت مفتی صاحب مولانا تھانویؒ کے خلیفہ راشد اور باکرامت ومحبوبِ خلائق علمی وروحانی ہستی تھے۔ نیلا گنبد کی مسجد بنوائی اور یہیں جامعہ اشرفیہ قائم ہوا۔ پھر اس کا جدید کیمپس مسلم

ٹاؤن (فیروز پور روڈ) میں قائم ہوا تو اس میں شفٹ ہوگیا جہاں آج ایک عظیم دینی یونیورسٹی کا مقام حاصل کر چکا ہے اور اس کے قدیم و جدید طلبا اسے ''دیوبند ثانی'' بھی قرار دیتے ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کا نام حضرت تھانویؒ کے نام پر رکھا گیا اور اس کی تاریخ مفتی محمد حسنؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا محمد مالکؒ، مولانا رسول خانؒ، مولانا عبدالرحمن اشرفیؒ اور مولانا محمد موسیٰ خانؒ جیسی بلند پایہ دینی علمی شخصیات کے ناموں سے روشن ہے۔ آج اس قافلۂ رشد و ہدایت کی تعلیمی قیادت و رہبری شیخ الحدیث مولانا فضل الرحیم اشرفی جیسی جلیل القدر اور محبوب خلائق شخصیت کے پاس ہے۔ آپ کی حکیمانہ نبض عصر حاضر کے رجحانات کو عالمانہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ آپ رابطہ ادب اسلامی کی بین الاسلامی ادبی تحریک کے پاکستان چیپٹر کے صدر ہیں۔ اپنے منصب جلیلہ اور جامعہ اشرفیہ کی بین الاقوامی شہرت و اہمیت کی بناء پر دنیا بھر میں علمی وفکری سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔ آج یورپ میں ہیں توکل مشرقِ وسطیٰ، پرسوں کسی اور خطۂ ارض پر۔ راقم کو دورۂ ترکی کے ایک علمی سفر میں ان کی معیت کا شرف حاصل رہا۔ یہ آپ کی ذمہ داریوں کا ایک حصہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ سلسلہ قاسمیہ تھانویہ کا یہ دبستانِ کتاب وسنت تاابد چمکتا دمکتا رہے۔

الحق: دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (ضلع نوشہرہ) کا ترجمان ماہنامہ ''الحق'' شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے نام سے منسوب ہے۔ حضرت شیخ الحدیث نے دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ تدریسی فرائض ادا کرنے کے بعد اپنے علاقے میں علوم کتاب وسنت کی درس گاہ قائم کی اور تادم آخر شیخ الحدیث کی حیثیت میں علمی فرائض ادا کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عوام میں اس قدر محبوبیت عطا کی کہ انہیں بارہا پارلیمنٹ کا ممبر چنا۔ ان کا لوگوں کے دلوں میں جو مقام تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو نے صوبہ سرحد سے اپنے سب سے مضبوط شخص نصر اللہ خٹک کو آپ کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا امیدوار بنایا تو اس کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ اس نے بھٹو سے کہا کہ آپ نے مجھے ایسے شخص کے مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے جس کا لوگ پیغمبر کی طرح احترام کرتے ہیں۔ (علماء سرحد کی محبوبیت کے بے شمار واقعات ہیں۔ مولانا مفتی محمودؒ نے ذوالفقار علی بھٹو کو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں شکست سے دوچار کیا تھا)۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے لیے ملک بھر میں بہت احترام پایا جاتا تھا۔ ایک بار ملک کے سب سے بڑے قانون دان اے کے بروہی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا اور ادب سے کہا کہ اللہ نے آپ کو میرے دل پر مکمل اختیار دیا ہے۔ یہ

سب کچھ اس فرمان کی ایک تعبیر ہے کہ من کان اللہ کان اللہ لہ(جو اللہ کا ہوجائے اللہ اس کا ہوجاتا ہے)۔ آپ کے شاگردوں کا سلسلہ انڈو پاک، افغانستان، ایران وغیرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے شاگرد حقانی کہلاتے ہیں۔ آپ کی جانشینی کی سعادت آپ کے لائق اور قابلِ فخر فرزند مولانا سمیع الحق کے حصے میں آئی جو بطریق احسن اپنا قائدانہ کردار ادا کررہے ہیں۔ معروف سیاستدان مولانا فضل الرحمن بھی حضرت شیخ الحدیث کے شاگرد ہیں۔ ماہنامہ ''الحق'' کا اعزاز ہے کہ اردو ادب و فلسفہ کی چوٹی کی شخصیت جناب محمد حسن عسکری (کراچی) نے زندگی کے آخری دور میں ایک سوال کے جواب میں ''آج کل کیا چیز زیر مطالعہ ہے'' کہا تھا کہ ایک گاؤں اکوڑہ خٹک سے رسالہ ''الحق'' آتا ہے بس وہی پڑھ لیتا ہوں۔ ہم دعا گو ہیں کہ ''الحق'' کی آب وتاب دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی رہے۔ (آمین)

الامداد: نام برصغیر کی عظیم روحانی شخصیت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے نام پر رکھا گیا اور اس کا مواد حکیم الامہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کسی ایک تقریر یا وعظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا روحانی مرتبہ اسی سے سوچا جاسکتا ہے کہ آپ قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی شخصیات کے مرشد تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اپنے روحانی رہبر کی محبت کے ایسے اسیر تھے کہ یاد آئی تو خانقاہ شیخ پر پہنچ کر ٹھکانہ کرتے اور ہفتوں عشروں تک قیام رہتا۔ یہاں تک کہ شیخ کے حکم پر واپسی ہوتی۔ حاجی امداد اللہؒ نے اس دور میں جب فرنگی سامراج کے برصغیر پر قبضے کے نتیجے میں برصغیر کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا گیا تھا، ہندوستان چھوڑ کر مکۃ المکرمہ کو اپنا مسکن بنایا اور دنیا نے انہیں مہاجر مکی قرار دیا۔ کتنے ہی لوگ جب حضرت حاجی صاحب سے روحانی راہ نمائی کے لیے مکہ میں حاضری دیتے تو انہیں حضرت گنگوہیؒ کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت فرماتے۔ حضرت حاجی امداداللہؒ کو بریلوی مکتب فکر سے وابستہ علماء کے ہاں بھی بہت عزت و احترام حاصل ہے۔ راقم نے مولانا عبدالستار خان نیازیؒ سے خود سنا کہ ہم حاجی امداد اللہ صاحب کا دلی احترام کرتے ہیں۔۔۔'الامداد' جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ (29 کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) سے جناب ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ہر پرچے میں حضرت تھانویؒ کا ایک مفصل وعظ ہوتا ہے جس کے مضامین کو آغاز میں ایک تفصیلی انڈیکس کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہر تقریر سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے یہ خطاب کس تاریخ (ہجری وعیسوی) کو کس جگہ فرمایا، کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر، اور کتنے وقت

میں بیان کیا۔ حاضرین کی تعداد کتنی تھی اور یہ وعظ کس شخص نے نوٹ کیا تھا۔ ان تفصیلات سے وعظ کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہر صفحے پر نیچے لکیر لگا کر چند مشکل الفاظ کے جدید و آسان زبان میں وضاحتی معنی دیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اشرفیہ تھانویہ کے فیوض و برکات کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت تھانویؒ امت مسلمہ کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ کا بہت محترم نام ہے اور یہ بھی ان کی کرامت کہی جاسکتی ہے کہ بعد از مرگ ان تفصیلات کے ساتھ ان کے ارشادات سے یوں استفادہ کیا جاسکتا ہے جیسے ان کی محفل میں حاضر ہوں۔ حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے علمائے امت میں خصوصی امتیازات سے نوازا۔ ان کا مربیانہ انداز ہر سائنسی معیار پر پورا اترتا ہے۔ بلاشبہ ان کا شمار ایسی ہستیوں میں کیا جاسکتا ہے جنہیں ''آیت من آیات اللہ'' کہا جاتا ہے۔ ایک مقام پر حضرت تھانویؒ نے حضرت گنگوہی سے کسی مسئلہ کا حل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا کہ ''برصغیر کے طول و عرض پر نگاہ ڈالتا ہوں تو آپ سے بڑھ کر کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا جس سے یہ دریافت کروں''۔ اسے پڑھ کر حضرت گنگوہی کے علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور حضرت گنگوہی کے مرشد محبوب کا نام حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہے اور اسی بے مثل ہستی کے نام پر جریدے کا نام ہے 'الامداد'۔ تو رسالہ 'الامداد' کا ٹائیٹل دیکھتے ہی ان اکابر کی نورانی ہستیوں کا گویا ایک ''روحانی دیدار'' ہوجاتا ہے۔

البرھان: یہ 71۔ اے فیصل ٹاؤن لاہور سے نکلنے والا ماہنامہ ہے جو ہمارے فاضل محقق جناب ڈاکٹر محمد امین کی برپاکردہ ''تحریک اصلاح تعلیم'' کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر محمد امین پنجاب یونیورسٹی کے اسلامی انسائیکلو پیڈیا ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تحقیقی شخصیت ہیں۔ ملک کی تعلیم دنیا میں اصلاحات کے لیے دل دردمند رکھتے اور سراپا جدوجہد رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جدید دور کے تقاضوں اور معیارات کے مطابق ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کا تصور موجزن ہے اور اس کے لیے ممکنہ جدوجہد اپنائے ہوئے ہیں۔ البرھان میں درج مجلس مشاورت کی اہم ترین شخصیت جناب احمد جاوید کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پی ٹی وی اور جیو ٹی وی کے بہت سے علمی مذاکروں و مباحثوں میں ان کے رسوخ فی العلم کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کریم نے انہیں اعلیٰ فلسفیانہ دماغ عطا فرمایا ہے، وہ ایک عملی صوفی و مربی اور عالم و ادیب مفکر اور ماہر اقبالیات ہیں۔ ''البرہان'' کی ٹیم میدان عمل میں ہے اور اپنی تاریخ بنانے میں محو جدوجہد۔ راقم خود اس تحریک کا ایک حقیر سا ذرہ و معاون اور اس کی کامیابیوں کا خواب دیکھنے والوں میں شامل ہے۔

الحمدللہ! ایک چھوٹی سی ٹیبل پر پڑے بیک وقت پانچ دینی رسالوں کی ایک جھلک سے ذہن میں تصورات کی جولہر آئی اسے قلم کی مدد سے سپرد قرطاس کردیا گیا اور ان سطور کے قاری تک بات پہنچ گئی۔ الحمدللہ علیٰ ذلک۔ آئیں ہم رب کریم سے التجا کریں کہ ہمیں علم وعمل کی اس راہ پر آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے جو اسے قبول ومنظور ہو (آمین، ثم آمین)۔

ڈاکٹر محمد امین

علماء کرام کے درمیان پائیدار اور مؤثر اتحاد کے لیے بعض تجاویز

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مختلف دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کے درمیان جب اتحاد کی بات کی جائے اور اس مقصد کے لیے جب کوئی اجلاس بلایا جائے یا کانفرنس اور سیمینار منعقد کیا جائے تو شرکاء عام طور پر خیر سگالی کا اظہار کرتے ہیں اور اتحاد و یگانگت کی باتیں ہوتی ہیں لیکن یہی علماء کرام جب اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے مسلک کے لوگوں کے درمیان بیٹھتے ہیں تو پھر لہجے بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ اتحاد کے لیے وقتی حمایت بھی قابل ستائش اور حوصلہ افزاء ہے لیکن ملی مجلس شرعی چونکہ اتحاد بین العلماء کی مستقل علم بردار ہے اور مختلف دینی مکاتب فکر کے درمیان مفاہمت اور تقارب کو فروغ دینا اس کے بنیادی اہداف میں سے ہے، اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ بعض اہم تجاویز پر غور کیا جائے جو علماء کرام کے درمیان ٹھوس اور پائیدار اتحاد کا موجب بنیں تاکہ بتدریج ایسی فضا قائم ہوجائے جو مختلف مکاتب فکر کو قریب لائے اور ان میں پائے جانے والے بُعد اور دوری کے خاتمے کا سبب بنے۔ چنانچہ یہ تجاویز اسی نیت سے پیش کی جارہی ہیں کہ علماء کرام ان پر غور فرمائیں اور ان پر عمل کی راہ ہموار ہو۔

اختلاف قابل مذمت نہیں

تاہم ایک بات شروع ہی میں واضح ہوجانی چاہیے کہ علماء کرام کے درمیان اختلافات بالکلیہ ختم کرانا نہ ہمارا ہدف ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ علماء کرام یعنی اصحاب علم جو دین اسلام کا خصوصی مطالعہ اور ذوق رکھتے ہیں، دیگر شعبوں کے اہل علم کی طرح ہیں جن میں علمی اختلاف معمول کی بات سمجھا جاتا ہے۔ جب سوچنے سمجھنے والے لوگ اکٹھے ہوں گے، مسائل پر غور کریں گے تو ان میں بہت سی

باتوں پر اتفاق ہوگا تو کئی باتوں میں اختلاف بھی ہوگا۔ اہل علم اور سوچنے سمجھنے والے لوگ مشینوں کی طرح نہیں ہوتے، اور نہیں ہوسکتے کہ بٹن دبایا اور ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ایک جیسے پرزے بننے شروع ہو گئے۔ یہ معاملہ مشینوں کے ساتھ تو ہوسکتا ہے، اہل علم کے درمیان نہیں ہوسکتا بلکہ یہ غیر فطری ہے اور ایسا ہونا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس اہل علم کے درمیان اختلاف بعض اوقات مفید ہوتا ہے اور 'اختلاف امتی رحمۃ' اگر حدیث نہ بھی ہو تو ایک پر حکمت مقولہ ضرور ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے وسعت اور سہولت ہے اور طبائع کا اختلاف اور تنوع بسا اوقات اس کا متقاضی ہوتا ہے جیسا کہ استاد ذوق نے کہا ہے کہ ؎

گل ہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن

اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

اسی طرح کسی شخص کا دلائل یا اپنے ذوق، ترجیح اور پسند کی بنیاد پر کسی خاص علمی یا فقہی مسلک و مشرب کو اپنا لینا بھی عین فطری ہے اور یہ ہرگز قابل اعتراض نہیں تاہم اگر علمی اختلاف یا کسی مسلک سے وابستگی اپنی حدود میں نہ رہے اور سبب تحزب و تعصب اور دشمنی بن جائے تو یہ رحمت کی بجائے زحمت بن جاتا ہے بلکہ باعث آزار و مصیبت ہوجاتا ہے اور فتنہ و فساد کو جنم دیتا ہے۔ اور ہمارے ہاں چونکہ اسی دوسری صورت حال کا غلبہ ہے اس لیے سوچ سمجھ کر ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جن سے یہ اختلاف اپنی جائز اور مفید حدود میں سمٹ جائے۔ لیکن ایسی تجاویز پیش کرنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ان عوامل و موثرات کا ایک تجزیہ کرلیا جائے جو اس بگاڑ کا سبب بنے ہیں تاکہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو تجاویز ہم پیش کریں ان کی افادیت و حکمت سمجھ میں آسکے اور ان پر عمل کی راہیں کشادہ ہوسکیں۔

فرقہ واریت کے اسباب و ذرائع

وہ طرز فکر و عمل جو جائز علمی اختلاف اور کسی مسلک و مشرب سے نارمل وابستگی کو باعث آزار و فتنہ بنا دیتا ہے اس کے کئی اسالیب اور طریقے ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ تحمل و برداشت کی کمی اور اختلاف رائے برداشت نہ کرنا

۲۔ فروعی اختلاف کو اصولی اور بنیادی بنا کر پیش کرنا

۳۔ ایک عام شرعی حکم کو شعائر قرار دے لینا

۴۔ اپنے مسلک و مشرب کو پورا دین بنا کر پیش کرنا اور دین کو اس میں منحصر سمجھنا۔

۵۔ مسلک کو مدار تحزب و تعصب بنالینا

۶۔ جذباتی اور اشتعال انگیز انداز میں دوسرے مسالک کی مذمت کرنا

۷۔ معمولی اور فروعی اختلافات پر فریق مخالف کو کافر، فاسق اور گمراہ قرار دینا۔
۸۔ مناظرہ بازی اور اس کا انداز اور سپرٹ کہ فریق مخالف کو شکست دی جائے اور اس کا نقطۂ نظر غلط ثابت کیا جائے۔

ان اسالیب کو ہماری سوسائٹی میں زیر تعلیم علماء کرام اور عوام کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے اور انہیں فروغ دینے کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں:

۱۔ مساجد کے ذریعے

مسجدیں اللہ کا گھر ہوتی ہیں اور ان میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ہر مسجد کسی نہ کسی مسلک کی ہوتی ہے اور دوسرے مسالک کے علماء وعوام کا داخلہ بالعموم وہاں ممنوع ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کسی دوسرے مسلک کے معروف آدمی کے وہاں چلے آنے کی صورت میں مسجدیں باقاعدہ دھوئی جاتی تھیں گویا وہ ناپاک ہوگئی ہوں۔ اب وہ بات تو نہیں لیکن اب بھی یہ بات ناپسندیدہ ضرور سمجھی جاتی ہے۔ ہر مسجد کا ایک نام رکھا جاتا ہے اور نام بالعموم ایسا رکھا جاتا ہے جس سے مسجد بنانے اور چلانے والوں کے مسلک کا اظہار ہوتا ہو اور بعض لوگ تو اس پر بھی اکتفا نہیں کرتے اور اپنے مسلک کو مسجد کے نام کا جزو بنا دیتے ہیں۔ اور یہی نہیں مسجدوں میں جمعہ کے جو خطبے دیے جاتے ہیں وہ بالعموم فرقہ وارانہ موضوعات پر دیے جاتے ہیں یا کسی دوسرے موضوع پر ہوں تو بھی خطیب صاحب کا اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلک کے اظہار اور اس کے واحد حق ہونے کے ابلاغ کو نہیں بھولتے۔ اس غرض سے مسجد کا خطیب اور امام صرف اس شخص کو مقرر کیا جاتا ہے جو مسجد بنانے اور چلانے والوں کا ہم مسلک ہو۔ یوں مسجدیں اللہ کا گھر بننے کی بجائے مسلک کا گڑھ بن جاتی ہیں اور ان سے ایک خاص مسلک کے فروغ کا کام لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مسجدوں پر زبردستی قبضے بھی کیے جاتے ہیں اور بات بدزبانی اور گالیوں سے بڑھ کر ہاتھا پائی اور سر پھٹول تک، اور بعض اوقات پستولوں اور بندوقوں کے استعمال تک جا پہنچتی ہے۔ عدالتوں میں مقدمے چلتے ہیں، مسجدیں سیل ہوتی ہیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دینی مدارس کا کردار

مسجدوں کی طرح دینی مدارس بھی ہمارے معاشرے میں لازماً کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر دینی مدرسے میں صرف اس مسلک کے طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے اور صرف ان اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے جو خاص اسی مسلک کے ہوں۔ مدرسوں میں جو کتابیں اور کتابوں کی شرحیں

پڑھائی جاتی ہیں ان سے بھی مسلک کا اظہار ہوتا ہے۔طریق تدریس بھی اپنے مسلک کی حقانیت ثابت کرنے والا اور دوسرے مسالک کا ابطال کرنے والا ہوتا ہے مثلاً حدیث شریف پڑھاتے وقت اگرکوئی ایسی حدیث آجائے جس سے اپنے مسلک کی تائید ہوتی ہو تو اس پر طول بیان کئی گھنٹوں اور بسااوقات کئی دنوں تک پھیل جاتا ہے اور اگر کوئی حدیث اپنے مسلک کے خلاف ہو تو اس کی تاویل بلکہ تضعیف ثابت کرنے کے لیے اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے دفاتر کھنگالے جاتے ہیں اور روایت و درایت کی رو سے باریک بینی کی انتہا کی جاتی ہے۔ اسی طرح زیر تعلیم علماء کو فن تقریر سکھاتے ہوئے ایسے موضوعات دیے جاتے ہیں اور ایسا اسلوب سکھایا جاتا ہے کہ مخالف مسلک کا تیاپانچہ کیسے کرتے ہیں۔اور بعض دینی مدارس میں تو 'فن مناظرہ' ابھی تک باقاعدہ جزو نصاب ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔

۳۔ دینی تعلیم کے وفاق

فرقہ واریت کی جڑیں گہری کرنے میں دینی تعلیم کے وفاقوں کا بھی ہاتھ ہے۔ہمیں نہیں معلوم کہ جب جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں دینی مدارس کے وفاقوں کی بطور ایک امتحانی ادارے کے منظوری دی جارہی تھی تو اس خواہش و کوشش کا محرک کون تھا کہ ہر مکتب فکر کا الگ دینی تعلیم کا وفاق بنایا جائے۔ اس کے پیچھے بعض تنگ نظر علماء تھے یا ہشیار اسٹیبلشمنٹ تھی بہرحال یہ بڑا ظلم ہوا کیونکہ جدید تعلیم کی طرز پر آسانی سے دینی تعلیم کا ایک وفاق بنایا جاسکتا تھا اور مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں قائم کی جاسکتی تھیں اور وہ یوں کہ ایک وفاق بنادیا جاتا جس کے دوسیکشن ہوتے۔ایک اہل سنت کے مدارس کے لیے اور دوسرا اہل تشیع کے لیے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے مدارس کا نصاب اس وقت بھی تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ان کا نصاب ایک مقرر کرکے ان کو اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی کے مصنفین کی کتابیں لگوالیں۔ اس طرح یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا تھا اور آج بھی حل ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ فرقہ واریت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا نہیں ہونے دیتے چنانچہ ہر مسلک کا الگ الگ وفاق بنادیا گیا ہے۔اس طرح مستقبل کے علماء کی تعلیم اور روزگار ان وفاقوں کی ڈگریوں سے بندھ گیا ہے اور لوگ ان مسلکی وفاقوں کے محتاج ہوگئے ہیں۔اس چیز نے بھی مسلک پرستی کے رویے کو مستحکم کیا ہے ان وفاقوں کا ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ یہ نصاب کی اصلاح میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔اور وفاق سے ملحق کوئی مدرسہ اپنے نصاب میں تبدیلی کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا۔

۴۔ دعوتی کام مسلک کی بنیاد پر

تبلیغی جماعت چلانے والے دیو بندی حضرات ہیں اور تبلیغی جماعت کی طرز پر یا اس کے مقابلے میں بننے والی حنفی بریلوی حضرات کی 'دعوت اسلامی' ہے۔ اہل حدیث حضرات کے واعظین اور مبلغین اور جماعت اسلامی کے مقررین بھی اپنی اپنی جماعت کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ سب حضرات اپنی دعوت کو 'دین کی دعوت' کہہ کر پیش کرتے ہیں اور اسے قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔

۵۔ پرنٹ میڈیا

ہر دینی جماعت اور ہر مسلک کی جماعت خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی اپنے رسالے (ہفت روزہ، ماہانہ) نکالتی ہے، اپنی دعوت پر مبنی پمفلٹ اور کتابیں شائع کرتی ہے اور بعض بڑی جماعتیں اور مسالک اپنے اخبار (روزنامے) بھی نکالتے ہیں اور ہر جماعت/مسلک ان ذرائع سے پھیلانے والی دعوت اور فکر کو دینی دعوت اور دینی فکر کہہ کر پیش کرتا ہے جب کہ درحقیقت وہ ان کی جماعتی اور مسلکی فکر اور دعوت ہوتی ہے۔

۶۔ الیکٹرانک میڈیا

اس کی فکر تو بہت کم اہل دین کو ہے کہ ہمارے حکومتی اور پرائیویٹ ٹی وی چینلز امریکہ و یورپ اور بھارت کی نقالی کرتے ہوئے فحاشی اور عریانی پھیلا رہے ہیں اور ان کے اکثر پروگرام اسلام مخالف سپرٹ کے حامل ہوتے ہیں اور یوں وہ مسلم معاشرے کی بنیادوں کو کمزور کرتے ہیں اور یہ کہ ان کا توڑ کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے پروگرام تیار کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے ٹی وی چینلز قائم کرنے کی ضرورت ہے جو اسلام کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اور غیر فرقہ وارانہ انداز میں پیش کر سکیں اور اسلام مخالف قوتوں کی سرگرمیوں کا توڑ کر سکیں البتہ کئی لوگوں نے ایسے دینی ٹی وی چینلز ضرور کھول رکھے ہیں جو رات دن فرقہ وارانہ پروگرام پیش کرتے ہیں اور دین اسلام کی بجائے اپنے اپنے مسلک کو فروغ دینے میں لگے رہتے ہیں۔

۷۔ مسلکی سیاسی جماعتیں

ہر مسلک کے لوگوں نے اپنی اپنی سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر لوگوں نے ووٹ مسلک کی بنیاد پر دینے ہوں تو ایک مسلک کا آدمی دوسرے مسلک کے قائد کو ووٹ نہیں دے گا۔ نیز یہ کہ مختلف مسالک کے لوگ ہمارے معاشرے میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی ایک علاقے، صوبے، ضلع یا حلقۂ نیابت میں جمع نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلک کی بنیاد پر بننے والی کوئی سیاسی

جماعت کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہ اتنی سادہ سی بات ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے افلاطون کی عقل درکار نہیں لیکن اس کے باوجود علماء کرام نے اپنے اپنے مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنائی ہوئی ہیں۔ انتخابات میں دینی سیاسی جماعتوں کے امیدوار جب ایک دوسرے کے مقابلے پر اترتے ہیں تو ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی ہوتی ہے اور ایک دوسرے میں کیڑے نکالے جاتے ہیں اور یوں دین اور علماء کرام کی ہوا خیزی ہوتی ہے۔ دینی حلقوں کے ووٹ بٹ جاتے ہیں اور سیکولر امیدوار کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس طرح مسلک کی بنیاد پر بننے والی یہ جماعتیں فرقہ واریت اور مسلک پرستی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ تھے وہ چند بڑے داخلی وسائل اور ذرائع جو فرقہ واریت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اب ہم خارجی ذرائع کی طرف آتے ہیں۔

فرقہ واریت پھیلانے والے خارجی ذرائع اور عوامل

ان میں سے اہم دو ہیں۔ ایک اسلام اور مسلم دشمن بین الاقوامی طاقتیں اور دوسرے ان کے گماشتہ مقامی حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں۔

۱۔ بین الاقوامی طاقتیں

ان میں سرفہرست امریکہ و یورپ اور ان کے حلیف بھارت، اسرائیل اور روس وغیرہ ہیں کہ **الکفر ملۃ واحدہ**۔ امریکہ و یورپ اسلام کے اس لیے حریف ہیں کہ یہ وہ واحد طاقت ہے جو مغربی فکر و تہذیب کے آگے سرنگوں ہوکر اپنی شناخت کھونے کے لیے تیار نہیں بلکہ اسلام ایک متبادل طرز فکر اور طرز زندگی ہے اس لیے مغربی ممالک مسلم دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً پوری کوشش سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ یہاں لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کریں بلکہ اسلام سے دور ہوں۔ یہاں شریعت نافذ نہ ہو اور معاشرے اور ریاست کے حالات اسلام سے موافقت رکھنے والے نہ ہوں۔ اس غرض سے مغرب اور ان کے حلیفوں کی خفیہ ایجنسیاں ہر وقت سازشوں میں مصروف رہتی ہیں اور ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ علماء اور ان کی جماعتوں میں پھوٹ ڈالیں اور انہیں آپس میں لڑائیں تاکہ دین کی ہوا خیزی ہو۔ یوں وہ فرقہ واریت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

۲۔ مقامی حکمران

داخلی عوامل میں سے دوسرا بڑا اور اہم عامل مغربی ممالک کے گماشتہ مقامی حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ اسلام و مسلم مخالف امریکہ و یورپ کی ہشیاری اور چالاکی یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرے

میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً دینی اور اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اپنے پاس سے وسائل خرچ نہیں کرتے (اگرچہ ان کے پاس وسائل کی کمی نہیں اور وہ جہاں چاہیں انہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں جیسے مثلاً عراق اور افغانستان میں) بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے وسائل ان کے خلاف استعمال کریں۔ اس کے لیے مغربی ممالک اور ان کی خفیہ ایجنسیاں مستقل سازشیں کرتی رہتی ہیں اور مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں کنگ میکر کا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ ایسے فوجی اور سول حکمرانوں کو اقتدار میں لاتی ہیں جو دینی سیاسی قوتوں کے خلاف سخت رویہ رکھتے ہوں بلکہ انہیں کچلنے اور ناکام بنانے میں پوری سرگرمی دکھائیں۔ مغرب کے ایجنٹ پاکستانی حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں پاکستان کی دینی (سیاسی وغیر سیاسی) جماعتوں اور ان کے دھڑوں میں پوری طرح دخیل ہیں اور ان کے اندر پھوٹ ڈالنے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف لڑانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں فرقہ واریت کو فروغ دینے والے جن متعدد داخلی عوامل کا ذکر کیا ہے ان کو متحرک کرنے میں بنیادی کردار پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب نے جو پنجاب کے ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل رہ چکے تھے ہمیں ذاتی طور پر بتایا اور علماء کرام کے ایک مجمع میں یہ بات علی الاعلان بھی کہی کہ ان کے پاس ایسے علماء کی ایک فہرست ہے جو پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے تنخواہ دار ہیں۔ مساجد و مدارس اور وفاقوں کی رجسٹریشن، فرقہ وارانہ ٹی وی چینلز کے اجازت نامے، رسالوں کے ڈیکلریشن، مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن۔۔۔ ان سب کاموں کی اجازت اور منظوری حکومت پاکستان دیتی ہے بلکہ اس کی مرضی اور پلاننگ سے اس طرح کی فرقہ وارانہ رجسٹریشنوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر حکومت اخلاص اور سنجیدگی سے مسلک پرستی اور فرقہ واریت ختم کرنا چاہتی ہو تو وہ اس میں بہت مفید اور تعمیری کردار ادا کرسکتی ہے اور مسلک کی بنیاد پر ان رجسٹریشنوں کو منسوخ کرسکتی ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ وہ ہرگز ایسا نہیں چاہتی بلکہ الٹا پاکستان میں فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو فروغ دینے میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی خفیہ ایجنسیاں اہم ترین کردار ادا کررہی ہیں۔

اتحاد کی تجاویز

علماء کرام اور دینی عناصر میں اتحاد کے حوالے سے حالات کے اس تجزیے، اتحاد کی راہ میں حائل مشکلات ومسائل اور افتراق وانتشار کا سبب بننے والے ذرائع اور عوامل کی نشان دہی کے بعد اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس صورت حال کے علاج اور اصلاح کے لیے کچھ تجاویز پیش کرسکیں:

ا۔ قیادت

ہمارے خیال میں پہلی اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی عناصر اور علماء کرام اس پر غور فرمائیں کہ ان کی قیادت موزوں اور مناسب ہاتھوں میں ہو۔قرآن وسنت میں قیادت کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ علماء سے زیادہ کون جانتا ہے۔ہم محض تذکیر کے لیے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں:

مثبت صفات جو قیادت میں ہونی چاہئیں: تقویٰ، امانت، قوت، اخلاص و بے نفسی، علم وحلم، تدبیر و فراست، دینی و اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا۔۔۔وغیرہ

منفی صفات اور کمزوریاں جو قیادت میں نہیں ہونی چاہئیں: حبّ جاہ و مال، قیادت کی خواہش وحرص، دنیا پرستی، رسوخ فی العلم نہ ہونا، انتظامی صلاحیتوں کا فقدان، آگے آنے کے لیے جوڑتوڑ اور سازشیں کرنا، انانیت اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت نہ ہونا۔۔۔وغیرہ

اصل چیز علم نہیں عمل ہے لہٰذا علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ آیا ان کی جماعتوں/تنظیموں/تحریکوں/ اداروں/ مدرسوں/ مسجدوں۔۔۔میں وہ لوگ بیٹھے ہیں جو قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو انہیں فتنہ وفساد سے بچتے ہوئے اصلاح کی بھرپور کوششیں کرنی چاہئیں اور خیر کی اجتماعی قوتوں کو متحرک کر کے اس صورت حال کا ازالہ کرنا چاہیے کیونکہ اگر قیادت نااہل ہو اعلیٰ اخلاقی صفات سے محروم ہو، دنیا پرست ہو اور ذاتی مفادات کے لیے سیکولر حکمرانوں سے ساز باز کرنے میں اسے تامل نہ ہو اور علماء کے قائدین اگر نہ رسوخ فی العلم رکھتے ہوں اور نہ متقی ہوں تو کون سی چوٹی سر کی جاسکتی ہے؟

II۔فراست

اتحاد کے لیے شیطان، نفس اور اسلام و مسلم دشمن بین الاقوامی طاقتوں اور ان کے گماشتہ مقامی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں کی چالوں اور سازشوں سے بچنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ایمان، اخلاص اور فراست کا زادِ راہ درکار ہے۔

III۔ اداروں کی اصلاح

دینی قیادت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مذکورہ سات داخلی اسباب کے بارے میں مثبت رویوں کے فروغ کے لیے اقدامات کرے جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔تفصیل سے قطع نظر ہم صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ:

ا۔ اعلان کر دیا جائے کہ مسجدیں اللہ کا گھر ہیں۔سب لوگ اس میں عبادت کر سکتے ہیں۔ ان کا انتظام

کسی ایک مسلک کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فرض کیجیے کسی ایک مسلک کے نمازیوں کی اکثریت ہو بھی تو انہیں چاہیے کہ اظہار خیر سگالی کے لیے دوسرے مسالک کے لوگوں کو بھی شریک انتظام وانصرام کرلیں۔

۲۔ دینی مدرسوں میں طلبہ کا داخلہ بلالحاظ مسلک ہو اور اسی طرح اساتذہ کی تقرری بھی بلالحاظ مسلک ہو۔ سب مل جل کر کام کریں۔ طریق تدریس معروضی ہو اور اختلافی امور میں مختلف مسالک کا نقطۂ نظر غیر جذباتی انداز میں بیان کردیا جائے۔ ان امور کی تربیت کے لیے مساجد کے آئمہ وخطباء اور دینی مدارس کے اساتذہ و مہتممین حضرات کی تربیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ دینی تعلیم کا وفاق ایک ہونا چاہیے۔ اہل تشیع کو چھوڑ کر باقی لوگ ایک نصاب پر متفق ہوجائیں، کتابیں اور شروحات مختلف ہوسکتی ہیں۔

۴۔ دعوتی کام میں قرآن وسنت کی نصوص اور ان کی متفقہ تعبیرات اور مشترکات بیان کیے جائیں جو کافی زیادہ ہیں۔ مسلکی اور جماعتی نقطۂ نظر کو ایک اجتہادی کاوش کے طور پر پیش کیا جائے جس میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے اور جسے ماننا ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کے خلاف جذباتی اور اشتعال انگیز تقریروں کا سلسلہ روک دیا جائے۔

۵۔ تحریری مواد یعنی کتابوں، رسالوں، پمفلٹوں اور اشتہارات وغیرہ میں جذباتیت پر مبنی افتراق انگیز تحریروں سے اجتناب کیا جائے اور برداشت اور تحمل کا ثبوت دیا جائے۔

۶۔ ٹی وی کسی ایک مسلک کا نہیں ہونا چاہیے اور ہو بھی تو اس کے پروگرام دینی ہونے چاہئیں نہ کہ مسلکی۔ ہمارے ہاں مشترکات بہت زیادہ ہیں جن پر سب مسالک کا اتفاق ہے، انہیں نمایاں کیا جائے اور اختلافی امور میں علمی اسلوب اور معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔

۷۔ مسلک پر مبنی دینی سیاسی جماعتیں ختم کردی جائیں اور نفاذ شریعت کے متفقہ نکات پر جمع ہوجایا جائے جن کا تعین کرنا ہرگز مشکل نہیں۔ مقامی سیاسی ایشوز پر اختلافات اگر ہوں تو انہیں برداشت کیا جائے۔

IV۔ رویوں کی اصلاح

مذکورہ بالا اصلاحی پروگرام کے حامی علماء کرام اپنا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنالیں (جیسے مثلاً ملی مجلس شرعی ہے) جس میں سب مسالک کے علماء کرام شامل ہوں اور وہ مساجد کے آئمہ وخطبا، دینی مدارس کے اساتذہ و مہتممین اور دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین وارکان کی تربیت کا وسیع پیمانے پر انتظام کریں جس میں انہیں باربار بتایا جائے کہ:

۱۔ امت اصولوں پر متحد ہے اور اس میں مشترکات بہت زیادہ ہیں۔ چھوٹے موٹے فروعی معاملات کو

غیر ضروری اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔

۲۔فقہی و کلامی مسالک اجتہاد پر مبنی ہیں جن میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے اور تعبیر و تاویل کے اختلافات ہوسکتے ہیں کیونکہ کسی مجتہد، امام اور فقیہ پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی کہ اس کا فرمانا قرآن و سنت کی طرح حرف آخر ہو لہٰذا مسلک کو دین اور حجت بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔اہل علم کے درمیان اختلافات ہوسکتے ہیں اور ہمیشہ سے ہوتے رہے ہیں لہٰذا نہ تو یہ قابل مذمت ہیں اور نہ انہیں بالکلیہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ انہیں برداشت کرنا چاہیے اور اپنی بات دلائل سے اور غیر جذباتی انداز میں کرنی چاہیے۔ اس اختلاف کو گروہ بندی، تعصب اور تحزب کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ آئمہ اربعہ کے درمیان اختلافات، اہل الفقہ اور اہل الحدیث کے اختلافات، اہل سنت و اہل تشیع کے اختلافات یہ سب صدیوں سے چلے آرہے ہیں لہٰذا سب فریقوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے اور انہیں فتنہ و فساد کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

۴۔بعض شرعی احکام شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے اذان اور السلام علیکم کہنا لیکن اہل مسالک کا یہ طرز عمل غلط ہے کہ انہوں نے بعض شعائر اپنے پاس سے گھڑ لیے ہیں جیسے نصوص سے ثابت ہے کہ ذکر جہری بھی کیا جاسکتا ہے اور خفی بھی لیکن جہری ذکر کو بعض لوگوں نے ایک خاص مسلک کی پہچان اور شعائر قرار دے لیا ہے یہی حال ازار کو ٹخنوں سے اونچا باندھنے اور آمین بالجہر اور خفی کا ہے۔

۵۔ اختلاف کا اظہار سلیقے سے کرنا چاہیے اور ہمیشہ ٹھنڈے دل و دماغ سے دلیل کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ طنزیہ، جذباتی اور اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ نفرت پھیلتی ہے اور تعصّبات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جزوی اور فروعی اختلافات میں فریق مخالف کی تفسیق و تکفیر کرنا یا اسے گمراہ قرار دے کر اس کی مذمت کرنا یا مناظرے کی سپرٹ کہ فریق مخالف کو ہر قیمت پر شکست دینا ہے، کوئی قابل قدر علمی رویہ نہیں ہے اور اس سے اجتناب برتنا چاہیے۔

۶۔اس ضمن میں عملی پیش رفت کے لیے ہماری آخری تجویز یہ ہے کہ سارے مسالک مل کر ایک 'اتحاد کمیٹی' یا 'مفاہمت کمیٹی' بنالیں جس میں ہر مسلک اپنے دو تین ثقہ و معتدل مزاج علماء بھیجے۔ یہ کمیٹی بیٹھ کر سنجیدہ علمی کام کرے۔ جو امور سب مسالک میں مشترکہ اور متفقہ ہیں ان کی فہرست تیار کرے اور جو امور مختلف فیہ ہیں ان کا تعین کرے۔ پھر ان مختلف فیہ امور کا جائزہ لے کہ کتنے ان میں اہم یا اصولی ہیں اور کتنے محض فروعی نوعیت کے ہیں۔ پھر ان نکات میں بھی جتنا تفاہم و تقارب ممکن ہو اس کا جائزہ لیا جائے۔ ان شاء اللہ اس طرح کی کوشش سے واضح ہوجائے گا کہ امت میں بلکہ مسالک میں بھی مشترکات اور متفقہ امور بہت زیادہ ہیں اور اختلافات برائے نام ہیں اور بعض لوگوں نے خواہ مخواہ ان کو ہوّا بنایا ہوا ہے۔

جہاں تاویل وتشریح کی گنجائش ہو ـــــ اور ایسا اکثر فروعات میں ہوتا ہے تو اسے جھگڑے کا سبب بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب یہ چیزیں مدار ایمان نہیں تو ان پر جھگڑا فضول ہے۔ اگر احادیث کی بنیاد پر ایک فریق نماز میں ہاتھ سینے پر باندھتا ہے اور دوسرا احادیث ہی کی بنیاد پر ذرا نیچے باندھتا ہے تو اس میں جھگڑے والی کیا بات ہے؟ دونوں فریق سنت ہی پر تو عمل کر رہے ہیں اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی تو ان کے پیش نظر ہے تو اسے کیوں مدار تحزب وتعصب بنایا جائے؟ **ھذامن عندناو العلم عنداللہ**

پاکستانیات عبدالرشید ارشد☆

قومی یک جہتی کی تلاش

آج پاکستان کے شہریوں کی زبان پر ایک ہی جملہ ہے کہ قوم منتشر ہے، قوم میں اتحاد و یکجہتی مفقود ہے جس کے سبب ملک بحرانوں کے بھنور میں پھنسا بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اخباری کالم ہوں یا ٹی وی چینل ہوں زیر بحث نقطہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ملک کے اندر کون سی ایسی شخصیت ہے جو قومی یکجہتی کی نعمت قوم کی جھولی میں ڈال سکتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہر کسی کی نظریں چار سو گھوم پھر کر ناکام لوٹتی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ قومی یک جہتی کا فقدان آج کا یا ماضی کے دس پندرہ سالوں کا قصہ نہیں ہے بلکہ:

یہ دو چار دن کی بات نہیں، نصف صدی کا قصہ ہے
اس گھر کی خاک اڑانے میں گھر والوں کا بھی حصہ ہے

تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والے مخلص اور محبِ اسلام رہنما قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کے آخری ایام میں ہی سیاسی خودغرضی نے جنم لیتے پَر پُرزے نکالنے شروع کیے تھے۔ قائدؒ کے مخلص رفقاء کی موجودگی میں ان کی سعی و جہد کے باوجود اتحاد و یکجہتی کی رسی بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی گئی اور پاکستان کی خالق کہلوانے والی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے انڈے بچے دیتے اس ملک کو رنگارنگ مسلم لیگوں کا 'تحفہ' دیا جو مسلمہ حقیقت کے طور پر آج ہر کسی کے سامنے موجود ہے۔ یوں اتحادِ ملت، انتشارِ ملت میں بدلتا چلا گیا جس کی بدترین شکل آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

یہ کیفیت پیدا کرنے میں جہاں بیوروکریسی کے مفادات کا حصہ تھا اور آج بھی ہے وہیں اس کے ذمہ دار سیاستدان اور علماء کرام بھی ہیں۔ خودغرض اور حبِ جاہ کے متوالے سیاست دانوں نے ماضی

☆ جوہر آباد (خوشاب)

کے ۶۳ سالوں میں جو جو ''کارہائے نمایاں'' سرانجام دیے یا آج دے رہے ہیں ملکی تاریخ کا اَن مِٹ باب ہیں تو دوسری طرف وارثانِ محراب ومنبر جو سیاست دانوں سے بڑھ کر اتحادِ امت کے ذمہ دار تھے اور ذمہ دار ہیں اپنے مسلکی جھگڑوں میں یوں الجھے کہ اتحادِ امت کے حوالے سے ان کی کارکردگی صفر رہی۔ یہ کسی پر تہمت نہیں ہے امر واقعہ ہے۔

اگر سیاستدانوں نے مسلم لیگ کی کوکھ سے بے شمار لیگیں نکالیں تو علماء کرام بھی ان سے پیچھے نہ رہے کہ پہلے اگر صرف دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور فقہ جعفریہ ''مارکیٹ'' میں تھیں تو پھر ہر مکتبِ فکر نے 'ترقی' کرتے اپنے اپنے گروہ بنالیے کہ اسلام اور اتحادِ امت منہ دیکھتا رہ گیا۔ اگر دیوبندی مسلک دس بارہ گروپوں میں تقسیم ہوا تو بریلوی مکتب فکر بھی پیچھے نہ رہا اور رہے اہل حدیث تو وہ پیچھے کیوں رہتے وہ مرکزی، سلفی اور غربا میں تقسیم ہوئے تو فقہ جعفریہ نے بھی کسر نہ چھوڑی۔ یوں ''وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا'' کے وارثوں کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔

نظام تعلیم یہ راہ روک سکتا تھا مگر مدارس اپنے اپنے مسلک کے قلعے بن گئے جہاں سے فریق مخالف پر کفر اور الحاد کے فتووں کی گولہ باری ہوتی رہی۔ سکول کالج اور یونیورسٹیاں لارڈ میکالے کی ذریت تیار کرتی رہیں بلکہ اس سے بھی چار قدم آگے بڑھیں اور مستقبل کی نسل کے لیے الحاد و فحاشی کو نصاب تعلیم کا حصہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ کہیں اردو میڈیم ہے تو کہیں انگلش میڈیم، نصابی کتب کی بھرمار کہ طالب علم کا اپنا وزن کم اور بستے کا وزن زیادہ، مخلوط تعلیمی ادارے۔ غرض تعلیم کو کسی بھی صورت میں نظریۂ حیات کی ہوا نہ لگنے دی گئی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

نظام عدل ملی انتشار کا راستہ روک سکتا تھا مگر جہاں ایک طرف نظریۂ ضرورت ایجاد کرلیا گیا وہیں دوسری طرف اہلمد سے لے کر جج صاحبان انصاف فروخت کنندگان بن گئے، **الاماشاء اللہ**۔ ''فروخت'' کے اس دھندے سے بچنے والے ''عدالتی شیڈیول کاسٹ'' ٹھہرے۔ ماضی قریب کی عدلیہ بچاؤ تحریک کی کامیابی سے نیک نام عدلیہ وجود میں آئی تو حکمرانوں اور ان کی معاون بیوروکریسی کو اس کے فیصلے ناگوار گزرنے لگے اور قدم قدم پر عدلیہ کو زچ کرنے کی مہم شروع کردی گئی۔ یہ کشمکش جاری ہے اور بظاہر اس کے ختم ہونے کے امکانات بھی نہیں ہیں کہ اقتدار سردھڑ کی بازی لگائے راستہ روک رہا ہے۔

گزرتے دنوں میں جب کوئی شخص بقائے پاکستان کے حوالے سے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے، حالات کا تجزیہ کرتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان پر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر آجاتا ہے کہ ؎

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ آج کے حکمران، اسٹیبلشمنٹ کے کارپردازان، سیاستدانوں کی اکثریت اور دینی طبقہ کی اکثریت مستیٔ کردار کے سرمایہ سے محروم ہے۔ کیا ان طبقات میں سے کوئی ہاتھ کھڑا کرکے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہے کہ ہاں میں ہوں وہ شخص جس میں یہ صفت موجود ہے۔ ملک یقیناً ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے مگر ان کے پیچھے چلنا کانٹوں کی راہ پر سفر ہے۔ گنتی کے یہ ''چند دانے'' کثیر عوامی تائید سے محروم ہیں۔

سوال یہ ہے کہ حالات کی اس گھمبیرتا میں کیا مایوسی کو سینے سے لگاکر نشر کرنے والوں کی طرح ''میٹھی پُرسکون'' موت کو گلے لگالیا جائے یا اس راستے کو تلاش کرکے اس پر ثابت قدمی سے قدم بڑھاتے منزل پالی جائے۔ اس راستے کی نشاندہی مشکل نہیں ہے۔ اخلاص نیت سے چلنے والوں کے لیے سفر سہل بھی ہے مگر کچھ قوتیں ہیں جو اس راستے کی راہ میں رکاوٹ ہیں یہ یہود و نصاریٰ کے پھیلائے جال ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب معاشرہ نہ صرف یہ کہ منتشر تھا بلکہ وہ ہر قسم کے عیوب کی دلدل میں گلے گلے تک دھنسا ہوا تھا۔ انسانی معاشرت کے لیے مطلوب سکون مفقود تھا پھر بقول حضرت عمرؓ ''ہم سینۂ دھرتی پر ذلیل ترین قوم بن چکے تھے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہم میں سے ہی ایک نبی مبعوث فرمایا، پھر دوسرا احسان خالق نے یہ فرمایا کہ نبی ﷺ پر قرآن حکیم نازل فرمایا اور تیسرا احسان یہ بھی فرمایا کہ ہمیں اس قرآن کو سینے سے لگانے کی توفیق بخشی۔ اس سعادت نے ہمیں سینۂ دھرتی کی معزز و معتبر اور مستحکم قوم بنادیا'' (مفہوم)

گویا قرآن کریم اور صاحبِ قرآن ﷺ کے فرامین مکمل اعتماد کے ساتھ یہ چیلنج قبول کرتے ہیں کہ ہمارے دامنِ رحمت میں آجاؤ تمہیں عملی زندگی میں مطلوب ہر سکھ، ہر خوشحالی اور ہر طرح کا استحکام میسر آئے گا۔ چالیس سال کا عرصہ مختصر عرصہ نہیں کہلاتا۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں جب مکمل شعور و آگہی کے ساتھ قرآن کا نظام حکمرانی نافذ تھا تو نہ صرف خطۂ عرب میں بلکہ خطہ سے باہر کم و بیش ۲۴ لاکھ مربع میل پر عامۃ الناس بلالحاظ مذہب، رنگ و نسل، سُکھ سکون، خوشحالی اور تحفظ سے فیض یاب تھے۔ اسے غیر مسلم مورخین تک نے بلاجھجک تسلیم کیا ہے۔

جس امر کی گواہی اپنے دیں اور اُن سے بڑھ کر پرائے بھی دیں تو عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ اسی راہ پر چلتے منزل مل سکتی ہے اور اس راستے سے جو جس قدر انحراف کرے گا اسی قدر منزل سے دور

ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق اس پر بھی گواہ ہیں۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے ادوار میں جس قدر اسلام کے زریں نظام حکمرانی کو اپنایا، حکمرانوں اور رعایا نے سُکھ پایا اور جہاں جس قدر انحراف کیا اسی قدر انتشار و بدنظمی اور عدم استحکام ان کا مقدر بنا۔ ماضی سے لے کر حال تک گرد و پیش گزرتے ایام میں مسلمان کہلوانے والی حکومتوں کے حالات کا تجزیہ کر لیجیے۔

کسی نے بڑی ہی خوبصورت بات کہی بلکہ ایک مسلمہ فارمولا ہر کسی کے سامنے رکھ دیا کہ:

"If there is sincerity in purposes, there is beauty in character;

If there is beauty in character, there is harmony in the home;

If there is harmony in the home, there is order in the nation;

If there is order in the nation, there is peace in the world.

یہ کیسا عمدہ فارمولہ ہے کہ اخلاص نیت ہو تو کردار میں نکھار، کردار میں نکھار ہو تو گھر سُکھی، گھر سُکھی ہوں تو قوم منظم، قوم منظم ہو تو امن عالم کی ضمانت ملتی ہے۔ اسلام مذکورہ فارمولہ کے پہلے ہی حصہ یعنی کردار میں نکھار کے ضمن میں جو اقدامات تجویز کرتا ہے وہ عبادات کا مؤثر نظام ہے۔ یعنی نماز، روزہ، انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ہر سطح پر ادائیگی یعنی بیوی بچوں، والدین، بہن بھائیوں، اعزہ و اقارب، ہمسائے اور محلہ دار پھر ہر وہ شخص جس سے کسی بھی طرح کا تعلق ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی معاشرتی پُرسکون زندگی کے لیے ایک نادر فارمولہ امت کو عطا فرمایا کہ ''جو تم اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ جو تمہیں خود نا پسند ہو وہی دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرو'' (مفہوم)

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذکورہ فرمان کو عدل کی بنیاد بھی کہا جا سکتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہیں سے عدل جنم لیتا ہے۔ معاشرتی اور ملی سُکھ، سکون، خوشحالی اور تحفظ کا ضامن یہی نظام عدل ہے۔ اسلامی تاریخ تو عدل و انصاف کی مثالوں کی امین ہے ہی، برطانیہ کی مثال لیتے ہیں جو ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنوں کی کارپٹ بمباری سے برطانیہ لہولہو تھا، شہر کھنڈر بن رہے تھے تو چرچل وزیر اعظم تھے۔ کسی صحافی نے چرچل سے کہا کہ آج کل آپ بہت پریشان اور رنجیدہ ہوں گے؟ جواب مختلف تھا! کیا برطانیہ کی عدالتیں انصاف نہیں کر رہیں؟''

چرچل کا کہنا تھا کہ اگر برطانوی عدالتیں انصاف کر رہی ہیں تو برطانیہ کا مستقبل تاریک نہیں ہوسکتا، مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، پریشانی کے بادل چھٹ جائیں گے اور پھر تاریخ شاہد ہے کہ وہی تباہ

حال برطانیہ کتنی جلد اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ عدل انسانوں کے مابین معاشرتی اُونچ نیچ کو دیکھے بغیر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ تاریخ اسلام میں کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں جب خلیفۂ وقت مدعی کے ساتھ بطور جوابدہ قاضی کے سامنے کھڑا ہوا یا دوسری مؤثر شخصیات عدالتی فیصلوں کے سامنے جھک گئیں۔ جس قوم نے، جس معاشرے نے عدل کو دل سے تسلیم کرلیا وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہا۔

یہ عدل ہی ہے جو معاشی عدم استحکام کا، جو معاشی استحصال کے سبب پیدا ہوتا ہے، قلع قمع کرتا ہے۔ آجر اور اجیر کے حقوق کا تحفظ، ملاوٹ اور ناجائز منافع خوری کا خاتمہ، رشوت اور دیگر حرام ذرائع سے لوٹ کھسوٹ کے آگے بند باندھنا یہ عدل وانصاف کے لیے قائم عدلیہ، ہر سطح کی عدلیہ، کی ذمہ داری ہے اور یہی عدلیہ جو دوسرے جرائم کے خاتمہ میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے عدلیہ کا کام بہت آسان کردیا کہ بعض گھناؤنے جرائم کی سزائیں تجویز ہی نہیں کیں بلکہ طریقہ تنفیذ تک طے کردیا مثلاً قتل کے بدلے قتل، کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک وغیرہ اور سزا عوام کے سامنے دی جائے۔

اسلام یا قرآن حکیم کی تجویز کردہ سزاؤں اور طریق تنفیذ کو ظالمانہ کہنے والے یہ حقیقت یکسر فراموش کرجاتے ہیں کہ قرآنی سزاؤں اور طریقہ تنفیذ کے سبب معاشرہ میں جرائم آٹے میں نمک کی سطح سے بھی نیچے آجاتے ہیں۔ سعودی عرب اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔ امریکہ جیسے مہذب کہلوانے والے ملک میں ایک آدھ گھنٹہ بجلی بند ہونے پر جو جرائم امریکی میڈیا میں رپورٹ ہوئے تھے وہ سعودیہ میں شاید دس بارہ سال میں نہیں ہوتے۔ پاکستان میں ایک ہفتہ میں ریکارڈ کیے جانے والے جرائم بھی سعودیہ کے ایک سال میں ہونے والے جرائم سے زیادہ ہیں صرف اس لیے کہ عدالت لمبی سماعت نہیں کرتی اور سزا عوام کے سامنے نافذ ہوتی ہے۔

ملی یک جہتی کا ضامن صرف اور صرف قرآن ہے جس کا پیغام ہے 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا' اور پھر یہ بھی فرمادیا بلکہ یاد دلادیا 'وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا۔۔۔ اتحاد و بھائی چارے کا راستہ دکھا کر پھر نافرمانی کرنے والوں کے حشر سے بھی آگاہ فرمادیا 'وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْم بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ'۔ اس آیت کو توجہ سے پڑھ لیجیے۔ رک کر غور کیجیے اور اپنے موجودہ ذاتی، سماجی و معاشرتی اور حکومتی سطح کے معاملات کا تجزیہ کیجیے تو ہر دکھ، ہر غم اور ہر نقصان کا سبب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

حاصل کلام یہ کہ یہ صرف قرآن وسنت ہے جو قومی یکجہتی کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ قرآن و

سنت کا پیغام عوام وخواص تک پہنچانے کے مکلف انبیاءعلیہم السلام کے وارث علماء کرام ہیں اور ان کے ذریعے یہ کام مؤثر انداز میں صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب وہ خود اپنی صفوں میں اختلاف رائے کی رحمت کو تفرقہ سے بچاتے ہوئے اور اپنی صفوں میں اتحاد و یکجہتی کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اہم ترین خدمت سرانجام دیں گے۔

ڈاکٹر انعام اللہ☆

صُفّہ۔مسلم تعلیم کا رول ماڈل

تحریک اصلاح تعلیم نے جولائی ۲۰۱۱ء میں جو دو روزہ قومی تعلیمی کانفرنس منعقد کی اس کا ایک بہت اہم موضوع ایک اسلامی سکول کے رول ماڈل کا تصور (وژن) تھا۔ جاپانی، ترکی اور پاکستانی موجودہ ملغوبہ نظام تعلیم کے بارے میں سیر حاصل گفتگو سے حاضرین متاثر ہوئے لیکن کوئی ایک جامع اور واضح ماڈل سامنے نہ آسکا۔

راقم کی نظر میں اگر انسانوں کے لیے رول ماڈل (اسوۂ حسنہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے تو انھی کا باضابطہ تعلیمی ادارہ صُفّہ ہی اسلامی سکولوں کے لیے رول ماڈل ہونا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق اور غزوات کا تذکرہ تقریروں اور تحریروں میں بہت ملتا ہے لیکن صُفّہ کے بارے میں معلومات خصوصاً آج کے تصور تعلیم کے تناظر میں، بہت محدود ہیں۔ جس شد و مد سے ترکی اور جاپانی ماڈل کا ذکر کیا گیا، یا آکسفورڈ کی پیروی یا نا پیروی کا رونا رویا گیا، اتنی قوتیں صُفّہ کو کھنگالنے میں صَرف ہوجائیں تو بہت ساری حقیقتیں آشکار ہوسکتی ہیں اور کوئی عملی صورت سامنے آسکتی ہے۔ آج اس دور میں معلومات کا سیلاب ہماری مٹھی میں ہے جس کے چند بٹن دبا کر قیمتی لائبریریوں سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے اور دورِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جھانک کر دیکھا بھی جاسکتا ہے۔

ہم اپنے لوگوں میں جمود کا ذکر کرتے ہیں جبکہ صفّہ نے قرآن کو مرکز و محور بنا کر اس دور کے نوجوانوں میں روح انقلاب پھونک دی اور ایسی تحریک پیدا کی جس کے نتیجے میں فتوحات، ترقی اور تحقیق کے دروازے مسلمانوں پر کھل گئے۔ صُفّہ کے طالب علموں نے جہانگیری بھی کی اور جہانبانی بھی، جہاں بینی بھی اور جہاں آرائی بھی۔ ایک طرف وقت کے بہترین گوریلا دستے بھی وجود میں آئے اور عمدہ استخبارات بھی۔ وہ طبیب بھی تھے اور بغداد اور کوفہ کی بستیوں کے مہندس بھی۔ پھر

☆ایم بی بی ایس۔ایم آرسی پی (برطانیہ) نگران الکلیۃ الاسلامیہ، سوجنڈہ، اٹک

انھی کے تربیت یافتہ لوگوں نے دنیا کو تجارت بھی سکھائی (ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن)۔ یہ طاقتور تحریک اس وقت سست روی کا شکار ہوئی جب خلافت میرٹ کی بجائے موروثیت کا شکار ہوئی اور عجم کے بھاری بھر کم علوم (فلسفہ، منطق وغیرہ) کی آمیزش سے غیر نافع علوم وجود میں آنے لگے۔ تعلیمی ادارے درباری انداز اور اقربا پروری کا شکار ہوئے اور بادشاہوں کے درباروں میں ذہنی عیاشی کے لیے مناظروں اور الفاظ کے ہیر پھیر سے بحث مباحثوں کو رواج دیا گیا (اصحاب کہف کے کتے کے رنگ اور کوے کی حرمت یا حلّت)۔ فرعون کے قدیم طریقے پر عوام کو تقسیم کرنا اور اقتدار کو طول دینا ذہانت ٹھہرا۔ ایسی ذہانت نے مسلمانوں کو حاسد، بزدل اور کینہ پرور بنا دیا۔ یوں طاقت کے نئے مراکز ایک ایک کر کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔

اب اگر کوئی جماعت یہ علم لے کر اٹھتی ہے کہ اس نے اصلاح کرنی ہے تو وہ پھر پہلوں ہی کے طریق پر ہوگی (قول امام مالکؒ) ہمارے پیش نظر نہ تو آکسفورڈ یا ورجینیا کی یونیورسٹیاں ہوں اور نہ ہی غرناطہ اور بغداد کی بھاری بھر کم جامعات جو تاتاری اور صلیبی یلغار کے سامنے مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔ ہمارے لیے ہر دور میں صُفّہ ہی مشعل راہ ہوگا جس کی نفسیات یا ذہنیت کو جذب کر کے دور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل کی جائے۔ دور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کے علمی اثاثے سے استفادہ ضرور کیا جائے لیکن اسے رول ماڈل کی جگہ نہ دی جائے۔

صُفّہ کے چند اوصاف

۱۔ مقصدیت: اللہ کی پہچان، بطور خلیفہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے مہارتیں اور علوم اور ان سب کو استعمال میں لانے کا مقصد عبادت اور بندگی۔

۲۔ نفسیات: خودی، فقر اور عشق (تفصیل کلام اقبال میں ہے)

۳۔ علم غیر نافع سے اجتناب: خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم غیر نافع سے پناہ مانگی۔ ہمارے تعلیمی اداروں بشمول پیشہ وارانہ اداروں میں ۸۰ فیصد معلومات غیر مفید ہوتی ہیں (Non applicable/Meaningless Knowledge) اور چھوٹے بچوں کے لیے بھاری بھر کم بستے تو قابل سزا جرم ہونا چاہیے۔

۴۔ سماعت، بصارت اور فؤاد کی مسئولیت: سائنس اور حکمت بھی تو یہی ہے یعنی ایسا علم جو مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہو۔

۵۔ کائنات پر غور وفکر کی حوصلہ افزائی: جب نیوٹن اپنے سر پر سیب گرنے کی گتھیاں سلجھا رہا تھا تو ہماری ذہانتیں بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے 'اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی' پر

صَرف ہورہی تھیں۔

۶۔ قدامت پرستی یا شخصیت پرستی کے بجائے حقیقت پسندی: کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی اپنی ذات کو مقصود نہیں بنایا بلکہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑنے کا ذریعہ بنایا۔ آباء واجداد کی روایتی باطل دانش کو چیلنج کیا اور کروایا۔

۷۔ طریقۂ تعلیم: جسے آج سقراطی طریقہ کہتے ہیں۔ طالب علم کی ذہنی ساخت اور استعداد کے مطابق شہری یا بدوی، بحث جیتنے کے لیے استدلال کی قوت۔

۸۔ معیارِ تعلیم: تعلیم مفت اور اس کے مواقع مساوی، امت کے چھوٹے سے لے کر بڑے آدمی کے بچے کے لیے۔ بعد میں بادشاہت نے مختلف معیارات کے تعلیمی اداروں کو جنم دیا۔

۹۔ یکساں عدل واحتساب

۱۰۔ دین ودنیا کی عدم تفریق

البرھان: بلاشک وشبہ وبلا اختلاف صُفّہ سب مسلمانوں کے لیے رول ماڈل ہے لیکن قرآن وسنت سے قطع نظر چونکہ علوم وفنون میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور زمان ومکان کی تبدیلی بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور دین اس تبدیلی کا لحاظ کرتا ہے، انکار نہیں کرتا جیسا کہ اجتہاد کے ادارے سے واضح ہے لہٰذا آج عصری حوالے سے نئے تعلیمی رول ماڈل کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

(آلعمران ۳:۱۰۳)

ملی مجلس شرعی کی طرف سے 'اتحاد امت کانفرنس'

مورخہ 24 ستمبر 2011ء کے مندوبین کو خوش آمدید

آج کا چیلنج یہ ہے کہ علماء کرام فروعی اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے نہ صرف خود متحد ہوجائیں بلکہ مسلم معاشرے اور امت کو بھی متحد کریں۔

ڈاکٹر محمد امین

ناظم اعلیٰ، ملی مجلس شرعی

مذکورہ کانفرنس میں بلاشبہ زیادہ تر گفتگو اصلاح تعلیم کے حوالے سے ہوئی اور رول ماڈل تعلیمی ادارے کا وژن زیادہ زیر بحث نہیں آیا۔ اس کی کسر ان شاء اللہ اگلی کسی کانفرنس میں پوری کردی جائے گی۔ تاہم تحریک اصلاح تعلیم کے ہاں نئے تعلیمی رول ماڈل کا واضح تصور موجود ہے، دیکھیے تفصیل کے لیے راقم کی کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' میں مضمون 'ایک نئے تعلیمی ماڈل کی ضرورت' اور دوسرے کئی مضامین۔ امین

سید ابوالحسن علی ندویؒ

مغربی تعلیم کا زہر

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے۔ یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، مطالعۂ کائنات وعلمِ اسماء کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ، ادب و فلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ، علوم عمرانیہ، حتیٰ کہ معاشیات و سیاسیات میں اس طرح سرایت کرجاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ بہت بڑے صاحبِ اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزا کو مضر اجزا سے الگ کرکے ''**خذ ما صفا و دع ما کدر**'' پر عمل کرے، اور اصل و زوائد میں فرق کرکے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے۔ طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں، لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے، خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین ومحکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلکِ زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ (جو محض ماضی کا ایک ملبہ (Debris) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لیے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظامِ تعلیم قبول کرتی ہے، جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے، تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب، اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں، ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور

قدیم افکار و اقدار کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی و جزائی انتظامات اس امر کے وقوع میں حارج نہیں ہوسکتے، اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو مؤخر کرسکتے ہیں، ملتوی نہیں کرسکتے۔ درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشوونما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کردیں مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظامِ تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے منصفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکاس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظامِ تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر ذہنی اور بعد میں (الا ما شاء اللہ) عینی ارتداد قدرتی ہے۔ ایک سلیم الطبع مغربی مبصر (محمد اسد، سابق Leopold Weiss) نے جس کو مغرب کے نظامِ تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج کا وسیع تجربہ ہے صحیح لکھا ہے:

''ہم نے گذشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کیے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالفِ اسلام اثرات سے پاک ہوسکتی ہے''۔

ہماری اس توقع کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کردیں جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لیے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہوسکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربّانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جارہے ہیں جنھوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے۔(*Islam at the Crossroads* P.83,84)۔

پھر وہ نصابِ تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفۂ تاریخ پر صادق آتی ہے، اس لیے کہ یورپ کا قدیم نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں، رومی(Romans) اور وحشی(Barbarians) تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہوسکتا ہے اس سے اہل مغرب کے حصولِ اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔(*Islam at the Crossroads* P 95)

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

''تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لیے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں'' (*Islam at the Crossroads* P 97) آگے چل کر وہ بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں: ''اگر مسلمانوں نے زمانۂ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظامِ تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظامِ تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی۔ اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہے۔ مغرب کے طور طریق اور اس کے لباس و مظاہرِ زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔(*Islam at the Crossroads* P 100)۔

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مفکرین نے بھی کی ہے جو ایشائی اور مشرقی مما لک میں اس نظامِ تعلیم کو رواج دینے والے تھے مشہور انگریز اہلِ قلم لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے جو یہ طے کرنے کے لیے بیٹھی تھی کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو۔ یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو'' (تاریخ التعلیم از میجر باسو، صفحہ ۸۶)۔

یہ مغربی نظامِ تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی مما لک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (Genocide) کے مترادف تھا۔ عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے جا بجا مراکز قائم کیے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انہوں نے مشرقی و مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس کے کئی برس بعد اقبال نے (جنہوں نے اس نظامِ تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا ؎

مباش ایمن از اں علمے کہ خوانی
کہ از وے روحِ قومے می تواں کشت　　(ارمغان حجاز صفحہ ۱۴۴)

تعلیم جو قلبِ ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر
(ضرب کلیم)

وہ مغرب کے اس نظامِ تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف (ضرب کلیم)

پروفیسر شاہد رشید ☆

ٹیکنالوجی اور اقدار

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی گفتگو کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی فاضلانہ گفتگو کے دو نکات خاص طور پر اہم ہیں: ایک تو یہ کہ ٹیکنالوجی value-neutral نہیں ہوتی بلکہ value-laiden ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ٹیکنالوجی کو develop نہیں کیا جاسکتا۔ آئیڈیالوجی بالآخر Technological Development کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہاں سوری صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اسلام بھی چونکہ ایک آئیڈیالوجی ہے لہٰذا اسے Technological Development کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے نکتے کا نتیجہ بھی یہ نکلتا ہے کہ مغرب سے آنے والی ٹیکنالوجی مغربی اقدار سے لبریز ہے اور اسے Islamize کرنے کی

ساری کوششیں نہایت سادہ بلکہ احمقانہ ہیں۔ ٹیکنالوجی کو مغربی اقدار سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو بات سوری صاحب کی گفتگو میں غیر واضح ہے وہ یہ ہے کہ ان اقدار کا سرچشمہ کیا ہے؟ ٹیکنالوجی کے ساتھ جو اقدار وابستہ ہیں کیا ٹیکنالوجی ان اقدار کا source ہوتی ہے؟ ٹیکنالوجی اور اقدار کے اس تعلق کو یوں ماڈل کیا جاسکتا ہے:

میری رائے میں یہ بات درست نہیں ہے۔ کسی سماج میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی اس سماج کی تہہ میں کارفرما فلسفۂ علم اور اس کے مخصوص ورلڈ ویو کی پیداوار ہوتی ہے اور یہی ورلڈ ویو اس معاشرے کی

☆ صدر شعبۂ سوشیالوجی، ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

سماجی اقدار بھی تخلیق کرتا ہے۔ گویا اقدار اور ٹیکنالوجی میں تعلق کچھ یوں ہے:

ٹیکنالوجی یقیناً Value-Laiden ہے لیکن اس لیے کہ یہ بھی اسی ورلڈ ویو کا نتیجہ ہے جو سماجی اقدار کے پس پردہ کارفرما ہے۔ اسلام اور مغرب کا اختلاف ورلڈ ویو کا اختلاف ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی پر اسلامی اقدار کی لازماً چھاپ ہوگی جیسے مغربی تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی پر مغربی اقدار کی چھاپ ہے۔ لیکن سوری صاحب کی بات اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ بہت generalized اور sweeping statement دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ "Technology as such" کسی بھی آئیڈیالوجی اور نتیجتاً اسلام کے ساتھ متصادم ہے۔ اس کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ سائنس جب بھی ٹیکنالوجی میں Translate ہوتی ہے تو اس کا واحد مقصد سرمائے (capital) میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام اور capital maximization ہی ٹیکنالوجی کی ترقی کا واحد محرک قرار پاتا ہے۔ ہر ایسا نظریہ اور نظام افکار جو انسانی سماج کی تشکیل و تعمیر کی کوئی منظم کوشش کرے گا اور سرمائے کی بے لگام بڑھوتری پر پابندی لگائے گا وہ ٹیکنالوجی کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوگا۔ اپنے اس thesis کو ثابت کرنے کے لیے سوری صاحب سویت انقلاب کی مثال پیش کرتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صرف ''مغربی ٹیکنالوجی'' نہیں بلکہ ٹیکنالوجی بجائے خود (Technology per se) معتوب اور روحِ اسلام سے متصادم ٹھہرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترم جامعی صاحب نے بھی اپنے تمہیدی کلمات میں اسلامی عہد میں پیدا ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کو ہدف تنقید بنایا تھا۔

سوری صاحب کا نقطۂ نظر جہاں ضرورت سے زیادہ قنوطیت لیے ہوئے ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کو کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا وہاں ان کا مقدمہ بہت over-generalized ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کو لازمی طور پر سرمایہ دارانہ اقدار کے تابع اور ہر طرح کی آئیڈیالوجی سے آزاد قرار دینے کے لیے سوشلسٹ ماڈل کی مثال ناکافی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اسلامی فکر و فلسفے کی بنیاد پر اسلام کا فلسفۂ سائنس مرتب کریں۔ اس فلسفۂ سائنس کی بنیاد پر تشکیل پانے والی سائنس ایسی ٹیکنالوجی کی اساس فراہم کرسکتی

ہے جو اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈائیلاگ

اسلام، مسلمان اور سائنس وٹیکنالوجی

برادرم مکرم جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے البرہان جولائی ۲۰۱۱ کے ص ۴۰ پر میری گفتگو میں ایک جملہ درج ہے حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا عروج ہوگا تو جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہوگا'' یہ سہواً کلام ہے اصلاً یہاں نام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا آنا چاہیئے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ تاریخی جملہ مولانا مودودیؒ نے ادا کیا لیکن اس جملے کی تشریح جناب مولانا علی میاںؒ کے قلم سے ان کی معروف کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کا عروج وزوال کا اثر'' کے ذریعے سامنے آئی۔ مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی کی اشاعت کے صفحہ ۱۹۱ پر سرخی ہے:

جہاد اور اجتہاد کا فقدان------ جہاد کی تشریح میں صفحہ ۱۹۴ پر علی میاں لکھتے ہیں ''ان کی تیاری پوری اور ان کی قوت مکمل ہو ان کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا بلکہ فولاد ہو وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو جس کا انسان انکشاف کر سکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو۔ ص ۱۹۵ پر اجتہاد کی تشریح میں لکھتے ہیں: نیز وہ اتنی ذکاوت و مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کو تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت اور قوت کے جو سرچشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے معتبر بنائیں بجائے اس کے کہ اہلِ باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین میں سربلندی اور فساد کے لئے ان سے مدد لیں۔ ص ۲۲۰ پر حضرت والا نے خالدہ ادیب خانم کی ایک تحریر کے حوالے سے ترکوں کے زوال کا تجزیہ کیا ہے تو اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ ''مگر یہ سادگی اور وسعتِ نظر جو نئی علمی تحقیقات کے لئے اس قدر ساز گار تھی مسلمانوں میں

زیادہ دن نہیں رہنے پائی۔علماء و متکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول وضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا یعنی تحقیق اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔عثمانیوں کے یہاں علماء نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی طرف توجہ نہ دی بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلم رو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔جب تک ملّتِ اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا‘‘۔ان دلائل میں بہت سے قرآن کی نصوص، اسلامی تاریخ وتہذیب، علمیت،قرآن کے بیان کردہ قانون عروج وزوال کے صریحاً منافی ہیں۔اجتہاد کا جو مفہوم علی میاں نے بیان فرمایا ہے اسلامی علمیت کا ذخیرہ اس تشریح سے خالی ہے۔کیا علم علومِ عقلیہ کو کہتے ہیں؟ یہ بھی عجیب بات ہے۔یہ تو محض فنون [Art & Craft] یا محض علوم آلیہ ہیں محض علم نہیں۔ایک جگہ علی میاں نے ایمان اور علم کی بات کی ہے اور یہاں علم سے مراد صرف عقلی علوم لئے ہیں یعنی ایمان علم نہیں ہے علم ایمان سے الگ ہے اور ایمان اگر عقلی علوم کی قوت سے محروم ہے تو وہ کامل نہیں ہے۔ اس دلیل کی زد اصحاب الاخدود اور اصحاب کہف پر بھی پڑتی ہے۔غزوۂ بدر، خندق میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو کیا اسباب کی وجہ سے ہوئی؟ غزوۂ حنین اور احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو کیا اسباب کی کمی کی وجہ سے ہوئی؟ قرآن دوٹوک انداز میں بتاتا ہے کہ فتح ہماری وجہ سے ہوئی اور شکست دنیا کی طرف التفات کے باعث جب کہ غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد قوت کفار سے زیادہ تھی اور مسلمان فتحِ مکہ جیسی عظیم الشان فتح بھی حاصل کر چکے تھے لیکن ایک لمحے کے لئے صحابہ کرامؓ کو یہ خیال ہوا کہ آج ہم تعداد میں زیادہ ہیں یعنی مسبب الاسباب کے بجائے دنیاوی اسباب پر بھروسہ ہوا تو شکست دی گئی قرآن کہتا ہے ’لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ‘ [۹:۲۵] غزوۂ احد میں بھی یہی ہوا مسلمانوں نے دنیا کی طرف نگاہ کی اور اسی لمحے انھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا قرآن بتاتا ہے ’وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰى ۔ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ‘ [۳:۱۵۲] قرآن تو یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو کبھی اسباب کی کمی کے باعث شکست نہیں ہوتی شکست کی وجہ محض اسباب پر بھروسہ، تقویٰ میں کمی، ان کی اپنی اغلاط، دنیا کی طرف التفات یا پھر اللہ کی جانب سے آزمائش کے باعث ہی ممکن ہے۔آخری غزوۂ تبوک کے موقع پر کئی صحابہ اس لئے شریک نہیں ہوسکے کہ ان کے پاس اونٹ یا سامان جہاد نہیں تھا انھیں میدانِ جنگ سے واپس بھیج دیا گیا۔

عرب کے صحرا میں رہنے والوں کے پاس اونٹ نہ ہوں اور تلوار اور نیزے نہ ہوں کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ آخری غزوہ بھی میسر اسباب کی بنیاد پر لڑا گیا کفار کے اسباب پر انحصار کر کے نہیں لڑا گیا۔ کفار نے جن علوم کا انکشاف کرلیا، جو ایجادات کرلیں وہ آپ کو تقویت دینے کے لئے ایجاد نہیں کئے لہٰذا عہدِ حاضر میں فتح کو علوم کفار سے مشروط کرنا درست تجزیہ نہیں۔ قرآن نے اقدامی جہاد کے لئے تعداد کی نسبت متعین کی ہے دفاعی جہاد کے لئے کوئی نسبت متعین نہیں کی ـــــ فتح اللہ کے لشکر سے ہوتی ہے' ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ ذٰلِکَ جَزَآئُ الْکٰفِرِیْنَ' [۹:۲۶] مومنوں کے پاس ہمیشہ اسباب بہت کم ہوتے ہیں ایمان زیادہ ہوتا ہے'' اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ' [۳:۱۷۳] جنگِ بدر میں بھی کامیابی اسباب سے نہیں ہوئی تھی اللہ کی طرف سے تھی' وَ لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ' [۳:۱۲۳] نیز دیکھیے ۳:۱۲۴، ۹:۸، ۸:۱۲۔ اگر اللہ مومنین کے ساتھ ہو تو کفار کی کثیر تعداد بھی مومنین کو شکست نہیں دے سکتی 'اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآئَکُمُ الْفَتْحُ وَ اِنْ تَنْتَھُوْا فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَ لَنْ تُغْنِیَ عَنْکُمْ فِئَتُکُمْ شَیْئًا وَّ لَوْ کَثُرَتْ وَ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ' [۸:۱۹] جہاد میں قتل مومنین نہیں کرتے تھے اللہ کی طرف سے ہوتا تھا' فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَآئً حَسَنًا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ' [۸:۱۷] اللہ کی سنّت یہ ہے کہ وہ کفار کے دِلوں میں مومنین کا رعب ڈالتا ہے' وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْھُمْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْھِمْ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا' [۳۳:۲۶] یہ مضمون آلِ عمران، انفال اور الحشر میں بھی بیان ہوا ہے۔ دیکھیے ۸:۱۲، ۳:۱۵۱، ۲:۵۹۔ اندلس نے سائنس وٹکنالوجی میں زبردست ترقی کی لیکن اندلس میں مسلمان اقلیت میں ہی رہے اور یورپ کو مسلمان نہ کرسکے بلکہ یہ سائنس وٹکنالوجی ان کو صفحۂ ہستی سے مٹنے سے روکنے میں بھی ناکام رہی حتّٰی کہ اُن کی عمارتیں عاد وثمود وفرعون کی طرح ضرور باقی رکھی گئیں مگر وہ عاد وثمود اور فرعون کی طرح مٹا دیئے گئے۔ مسجدِ قرطبہ میں کلیسا ہے اور مسجد، اذان، مصلّے اور مصلی سے محروم۔ لوگ مادی ترقی سے نہیں روحانیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مادہ پرست مادی ترقی سے متاثر نہیں ہوتا۔ اگر علم کا مطلب اسلامی علمیت میں علومِ عقلیہ ہی ہے تو عباسیوں اور اندلسیوں کو اس میں عروج کے باوجود تاتاری جیسے جاہلوں اور ان پڑھ عیسائیوں سے کیسے شکست ہوگئی جو سائنس وٹکنالوجی میں عباسی اور اندلسی خلافت سے بہت کم تر تھے؟ محترم علی میاں کے خیالات کا موازنہ مولانا مودودیؒ کے بعض

نثری اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو علیؒ میاں کی کتاب سے پہلے تحریر کئے گئے تھے۔ مولانا محترم زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بناء پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لئے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے''۔ (تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان' دوم' ص ۱۴۹)

''جب تک علمائے اسلام اس ماخذ ومنبع [قرآن وسنّت] سے اکتسابِ علم کرتے رہے اور صحیح غور وفکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی وعملی مسائل حل کرتے رہے، اس وقت تک اسلام زمانے کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور وفکر کرنا چھوڑ دیا گیا' جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہوگئی' جب آنکھیں بند کر کے پچھلے محدثین اور مفسرین کی تقلید کی جانے لگی' جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنالیا گیا' جب کتاب وسنّت سے براہِ راست اکتسابِ علم ترک کر دیا گیا اور جب کتاب وسنت کے اصول چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنالیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رک گئی۔ اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارثِ علم وعمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح وتفسیر میں منہمک ہوگئے۔ جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے' نئے نئے مذاہب نکالنے اور دوراز کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے۔ (ایضاً' ص ۱۵۸)

''فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل وفکر سے کام لیتی اور تحقیق واکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے' اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے' اور جو قوم تفکر وتدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہوجاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا اور مظلومیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لیے ذہنی ومادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں' اسی قدر غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں اور طاقت ور (ذہنی' مادی دونوں حیثیتوں سے طاقت ور) قومیں' ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمران ہوجاتی ہیں''۔ (تنقیحات' ص ۹۔۱۰)

وہ اور کوئی تہذیبی وتمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جاسکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو

ایک مقابل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے''۔ (جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل ص ۹۰۔۹۱) عادِ ثمود فرعون کے انبیاء ان قوموں کے مقابل تہذیبی و تمدنی معیار کے حامل نہیں تھے بے سروسامانی ہی ان کا سامان تھا۔

قرآن سے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی مسلمان اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں اور مسبب الاسباب کو ایک لمحے کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں تو شکست، پسپائی، ہزیمت، ان کا مقدر ہوتی ہے مثلاً غزوۂ حنین غزوۂ احد ــــ قرآن نے عروج و زوال کا قانون بہت مختصراً یہ بتایا ہے کہ ہم نے ہر امّت کو صرف اور صرف اُس کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کیا اور خلافت ارضی امّتوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کے انعام کے طور پر دی جاتی ہے یہ کسبی نہیں ہے کہ جب دل چاہے ہم خلافت کے امیدوار بن جائیں اور تختِ خلافت پر قبضہ کر لیں۔ استخلاف فی الارض کوشش، جدوجہد اور سائنس و ٹکنالوجی سے مشروط نہیں ہے --- اللہ تعالیٰ رماتے ہیں کہ یہ اس کا انعام ہے 'وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُم فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِیْ ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنم بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِی لاَ یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ' [۲۴:۵۵] اور خلافت اس لئے دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ اب تم دنیا میں کیسے کام کرتے ہو' قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَ مِنم بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَ یَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ' [۷:۱۲۹] ـ۔۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کفر و شرک کی حکومت اور اللہ کے بندوں کی حکومت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق نہ ہو تو اقتدار مسلمانوں سے چھین لیا جاتا ہے اگر مسلمانوں کو وہی کام کرنے ہیں جو کفار کر رہے ہیں تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن نے استخلاف فی الارض کے صرف چار مقاصد بتائے ہیں: امر بالمعروف، نہی عن المنکر، صلٰوۃ و زکٰوۃ 'اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ' [۲۲:۴۱] اس نے ترقی، مادی صلاح و فلاح، اور سائنس و ٹکنالوجی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ امتِ مسلمہ کا اصل کام معروف کا حکم اور منکر کا فروغ ہے 'کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ' [110:3] انبیاء کرام کی عظیم الشان تہذیبوں کی کوئی مادی علامت محفوظ نہیں لیکن ان کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ جن تہذیبوں کو مٹا دیا گیا ان کی آیات، علامات، عمارات عاد و ثمود و سباء و فرعون کے آثار کی صورت میں قیامت تک محفوظ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی ٹکنالوجی میں اضافہ کر کے بنی

اسرائیل کی عمارتوں سے بہتر عمارتیں تیار نہیں کیں۔ روئے زمین پر انبیاء کی تہذیبی وتمدنی فتوحات کی صرف دو عمارتیں باقی ہیں خانہ کعبہ اور حجرۂ نبویؐ۔ انبیاء کی تہذیب ان کا تمدن، ان کی فتوحات روحانی ہوتی ہیں مادی نہیں وہ آخرت کو دنیا پر مقدم کرنے آتے ہیں لہٰذا روحانی فتوحات اور روحانی برتری اور آخرت طلبی کے مظاہر ان کی تہذیب میں عام ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ ابھی تک بہت سے مسلمانوں کے فہم سے ماوراء ہے کہ دنیا اور اس کے اسباب محض ضرورت ہیں اور ضرورت کے درجے میں رہیں گے ان اسباب کا حصول ان پر فرض ہے جو ان کی دسترس میں ہیں وہ اسباب جو کفار کے قبضے میں ہیں ان کو چوری اور ڈکیتی کے ذریعے حاصل کرنے کا حکم مسلمانوں کو نہیں دیا گیا۔ مسلمانوں کے لئے آخرت اہم تر و اصل ہدف مقصود ہے لہٰذا وہی علوم ترقی کریں گے جو آخرت طلبی کو ممکن بنادیں مگر جب توجہ کا رخ دنیا پر ہوگا تو لازماً دنیاوی علوم ترقی کریں گے اور اس میں اضافہ ہوگا لہٰذا مغرب اگر دنیا میں ہم سے آگے نکل گیا تو اس میں شرم کی بات نہیں۔ اس نے اپنی توجہ کا تمام رخ تمام صلاحیتیں صرف مادیت پر مرکوز کردی ہیں آخرت کو ترک کردیا ہے آپ بھی یہی کام کریں تو آپ کے یہاں بھی یہی نتیجہ نکلے گا سائنس سے ہماری مرعوبیت بلا وجہ ہے۔ اس کی افادیت اپنی جگہ یہ کہنا کہ اسلام سائنس کا خالق ہے جیسا کہ بہت سے جدید مفکرین کہتے ہیں وہ یہ بتائیں کہ اگر قرآن سے ہی تجربی علوم نکلے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے قرآن کی آمد سے پہلے دنیا کو ان تجربی علوم سے کیوں محروم رکھا؟ اگر یہ علوم قرآن میں تھے تو قرآن کا سب سے بہترین فہم صحابہؓ رکھتے تھے تو صحابہؓ تابعین میں سے کسی ایک سائنسدان کا نام بتادیا جائے؟ اگر صحابہؓ جو خیر القرون میں تھے سائنس قرآن سے برآمد نہیں کرسکے تو یا تو ان کا فہم دین ناقص تھا نعوذ باﷲ! یا انھیں جہاد کے باعث فرصت نہ ملی یا ان کے علوم ہم تک منتقل نہیں ہوئے۔ لہٰذا عقلی علوم کے لئے قرآن سے استدلال ایک غیر عقلی رویہ ہے عقلی علوم کی دریافت اور تردید کے لئے قرآن کی نہیں عقل کی ضرورت ہے۔ یہاں عقل استعمال کی جائے اور یہ تابع ہو وحی الٰہی کے۔ ایسی عقلی سرگرمی جو اپنے وسائل و ذرائع سے کی جائے مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے اس کے ساتھ ساتھ تمام تر توقعات اﷲ ربُّ العزت سے وابستہ کی جائیں کثیر اسباب میسر ہونے پر بھی بھروسہ اسباب پر نہ کیا جائے یہ ہے قرآن کا اصل پیغام۔

علی میاں کی مذکورہ کتاب ۱۹۴۶ء میں نوعمری میں لکھی گئی اس کے بعد ان کی تمام تصانیف اور ان

☆ مکتوب نگار اگر مولانا علی میاںؒ کو یہ الاؤنس دینا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی دوسری کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش' بھی اسی موضوع پر ہے جس میں مولانا نے اپنے اسی مؤقف کو بار بار پُرزور طریقے سے پیش کیا ہے اور اس کتاب پر ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک تین مرتبہ نظر ثانی بھی کی ہے۔ امین

کی پوری زندگی ان کے مذکورہ بالا موقف کی تردید کرتی ہے لیکن اپنی دینی ملی علمی مصروفیات کے باعث انھیں کبھی ماضی کی طرف پلٹ کر اس کتاب کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ یقیناً اس سے رجوع کرتے ☆ افسوس یہ ہے کہ حال ہی میں پرنسٹن یونیورسٹی نے عالمِ اسلام کے جونمائندہ متون شائع کئے ہیں اس میں علی میاں کی اس کتاب سے منتخب کردہ تحریر کو اسلام کی نمائندہ تحریر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مشہور مستشرق RoxanneL. Euben کی کتاب *Princeton Reading in Islamic Thought Text & Contexts From Al- Banna to Bin Laden, Muslim Decadence & Revival* میں ایک متن علی میاں کی مذکورہ بالا کتاب کے انگریزی ترجمے سے مستعار لیا گیا ہے افسوس ہے کہ علی میاں کی کتاب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر سعودی عرب کے کالجز کے نصاب کا حصہ ہے۔ کتاب کے اکثر مباحث جدیدیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تقاریر کا مجموعہ **مغرب سے کچھ صاف باتیں**، بھی جدیدیت کا ترجمان ہے لیکن کئی جگہ جدیدیت کا رد بھی ہے۔ یہ ردعلی میاں کے ایمان کا کرشمہ ہے لیکن علی میاں کی شخصیت اور بعد کی تمام کتابیں نہ صرف جدیدیت کا مکمل رد کرتی ہیں بلکہ ان کی تحریریں امت کو ایک نئے علمی روحانی جذبے سے سرشار کرتی ہیں علی میاں اپنے تمام تر احترام، خدمات عظمت کے باعث سب کے لئے قابلِ قدر ہیں مگر وہ ایک انسان ہیں ان کی غلطیوں سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا ان کا جب بھی ہم جائزہ لیں گے تو ان کے کُل کو پیشِ نظر رکھیں گے ان کی چند خامیوں کے باعث ان کے عظیم کام کا انکار نہیں کریں گے۔ یہی رویہ اسلامی تہذیب، علمیت، تاریخ میں تمام لوگوں کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے پیشِ نظر رہنا چاہیے ـــــ سائنس اور انسانی حقوق کے حوالے سے عالمِ اسلام میں اکثر و بیشتر تحریریں حقیقت کی مکمل ترجمانی نہیں کرتی ہیں حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جیسے عظیم مفکر بھی بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کی مابعد الطبیعیاتی اساسات کو نظر انداز کرکے اسے غیر اقداری تصور کرکے اس کا اسلامی جواز پیش کردیتے ہیں یہ غلطی ہے لیکن اس غلطی سے ان کے مقام و مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جب تک ہم علمی معاملات میں اس رویے، اس توازن اور اس اصول کے تحت نقد و نظر نہیں کریں گے ہمارے زوال کی رات مزید طویل ہوتی جائے گی۔ قرآن نے امتوں کے زوال کا سبب کثرتِ گناہ، نفس پرستی، خوفِ خدا سے محرومی بتایا ہے کسی ایک آیت میں بھی زوال کا سبب علوم عقلیہ، سائنس وٹکنالوجی سے محرومی نہیں بتایا گیا **وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا**

تَذۡمِیۡرًا' [16:17] نیز دیکھیے 117:11، 59:28، 11:3، 52:8، 13:10، 69:27، 40:29، 8:65، 9:69، 10:69، 2:71۔ یہ سب آیتیں زوال کا سبب سائنس و ٹکنالوجی نہیں بتاتیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ کسی کالج کے استاد وہاب سوری صاحب کے سائنس وٹکنالوجی کے موقف پر کچھ کہنا چاہتے ہیں انشاء اللہ اسے پڑھیں گے لیکن سائنس وٹکنالوجی کا مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ایک گھنٹے کی تقریر اور چند صفحات کے اعتراضات سے یہ مسئلہ حل ہوجائے یہ ایک نہایت سنجیدہ گھمبیر علمی مسئلہ ہے جس کے لئے ہمیں عمیق مطالعے اور طویل مباحث کی ضرورت ہے۔ البرہان میں یہ سلسلہ شروع ہورہا ہے تو میری رائے میں اسے جاری رکھیے بلکہ اسے مستقل تحریری مباحثے کی شکل دیجیے جو لوگ سوالات اٹھارہے ہیں ان کے سوالات آنے دیجیے تا کہ ہم تفصیل سے یہ بتاسکیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ گزشتہ چھ ماہ میں بہاول پور، پنجاب، ملتان، ساہیوال، چیچہ وطنی، لاہور، اوکاڑہ وغیرہ جانے کا موقع ملا اور سیکولر یونیورسٹی کے اساتذہ اور وہاں سے فارغ التحصیل دانشور حضرات اور اہلِ علم سے تبادلۂ خیالات کی سہولت بھی میسر آئی نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جب ان حضرات سے سائنس وٹکنالوجی کے معاملات پر بحث وگفتگو ہوئی تو ان میں سے ننانوے فی صد نے اس موضوع پر کسی بنیادی کتاب کا مطالعہ تک نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں عالمی فلسفہ کانگریس کا صدر اور ہائیڈیگر کا استاد ہزرل اور یورپین سائنس کی آفاقیت کو رد کرکے اس پر تنقید Critique on Euroupean Sciences کے نام سے مغرب میں لکھ رہا تھا ۱۹۳۶ء میں اس کا شاگرد اور کنگ فلاسفر ہائڈیگر Question Concerning Technology میں ٹکنالوجی کو خدا کی جگہ لیتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر عالمِ اسلام میں آج بھی اگر سائنس کے حوالے سے علمی تنقید کی جائے تو سب اس کے دفاع کے لئے بغیر کسی مطالعے کے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس سفر میں یہ معلوم ہوا کہ سیکولر جامعات سے وابستہ اہلِ علم میں سے کسی ایک نے بھی کارل پاپر، فیرا ربینڈ، لے کاٹوس، کوہن وغیرہ کو سرے سے نہیں پڑھا یہ اس کے نام تک نہیں جانتے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کو فلسفے اور فلسفۂ سائنس سے بھی واقفیت نہیں ہے یہ سائنس کی مابعد الطبیعیات سے واقف ہی نہیں ہیں، انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سترہویں صدی سے پہلے سائنسداں کی اصلاح استعمال نہیں ہوتی تھی اس وقت سائنس فلسفے کی شاخ تھی اور طبعی علوم میں رسوخ رکھنے والے کو نیچرل فلاسفر کہا جاتا تھا--- یہ حضرات سائنس وٹکنالوجی کا فرق تک نہیں جانتے انھیں ٹیکنو سائنس کا بھی علم نہیں۔ یہ سائنٹس ازم کی اصطلاح سے بھی واقف نہیں ان حضرات نے Ted Peter, Muzaffar Iqbal, Lord North bourne

Smith huston, Ziauddin Sardar, Dr. Nasar جیسے مصنفین اور روایت کے مکتبۂ فکر کی جدید سائنس پر تنقید کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں سنا---اب اس طرح کے لوگ اگر کسی مکالمے میں شرکت فرمائیں تو اس سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے بالکل اسی طرح سفر کے دوران انسانی حقوق کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی تو اس کا حال بھی یہی تھا کسی کو یہ نہیں معلوم ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کے منشور میں انسان کی تعریف کیا ہے؟ اس منشور میں خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ گناہ ثواب کیا ہے؟ منفی آزادی اور مثبت آزادی کسے کہتے ہیں؟ کانٹ اور فوکالٹ کے تاریخی مضامین What is Enlightenment جس میں روشن خیال انسان کی تعریف پیش کی گئی ہے یہ حضرات ان مضامین سے سرے سے ناواقف ہیں جو حضرات حقوقِ انسانی کے منشور کی مابعد الطبیعیات سے واقف نہیں وہ اس موضوع پر جو گفتگو کریں گے تو وہ صرف وقت کا زیاں ہوگا۔

ان حضرات کو آزادی مساوات ترقی کی مغربی اصطلاحات کا حقیقی مطلب تک نہیں معلوم۔ اصطلاحات کا کبھی ترجمہ نہیں ہوسکتا تشریح ہوسکتی ہے یہ عربی اصطلاح حریت کو مغربی اصطلاح Freedom کا مترادف سمجھتے ہیں جب کہ آزادی کا لفظ فریڈم کی کافرانہ جامعیت کو بیان کرنے سے قاصر ہے جب آپ کو منشور انسانی حقوق کی اصطلاحات جو خالص فلسفیانہ اصطلاحات ہیں ان کا بھی نہیں معلوم تو آپ سے کیا مکالمہ کیا جائے؟ بے چارے Human اور عبد کا فرق تک نہیں جانتے انھیں Wealth اور Capital کا فرق تک معلوم نہیں۔ یہ بازار اور مارکیٹ میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ سول سوسائٹی کی اصطلاح کے مضمرات اور فلسفیانہ اساسات سے تک ناواقف ہیں۔ ان حالات میں مکالمہ کیا ہو؟ بہرِ حال آپ کوشش جاری رکھیں اور ان مباحث پر اگر تحریری مباحثوں کا سلسلہ شروع کریں تو بہت فائدہ ہوگا ۔ زبانی گفتگو، تقریروں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے ،تحریری مباحثے زیادہ سود مند ہیں۔بہتر یہ ہو کہ سوالات کرنے والے اعتراضات اٹھانے والے ہر دلیل کے ساتھ کوئی حوالہ پیش کریں صرف تقریر نہ کریں۔ برھان میں اب تک جو خطوط اور مضامین سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے حق میں شائع ہوئے ہیں ان میں کوئی علمی دلیل نظر نہیں آتی صرف ایمان ویقین کی بنیاد پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک علمی پرچے میں ہر سطر دلیل اور حوالے سے آراستہ ہونی چاہیے۔عبدالوہاب سوری صاحب پر نقد اگر ان اصولوں کے تحت ہو تو اسے شائع کیجیے ورنہ ان سے کہیے کچھ پڑھنے کے بعد حوالے پیش فرمائیں۔سائنس پر تنقید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس کے فوائد کو یک لخت ترک کر دیا جائے، اسے حرام قرار دے دیں، کار چھوڑ دیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں۔ جدید زندگی میں سرمایہ دارانہ نظام نے گھوڑا اور بکری رکھنا محال

بنادیا ہے ایک ایسا نظامِ زندگی مسلط کردیا گیا ہے کہ فطری زندگی کی طرف لوٹنا ناممکن ہے۔آپ سال بھر میں جس مالیت کا بھی دودھ خریدتے ہیں اتنے رپوں میں کئی بکریاں اور کئی گائیں خرید سکتے ہیں لیکن شہروں میں ان جانوروں کو کہاں رکھیں؟ چراگاہ کہاں سے لائیں؟ جس نظامِ زندگی نے ہم سے اصلی ددھ چھین لیا ہے اس کے قصیدے پڑھتے ہوئے ہم کو شرم تک نہیں آتی۔ ڈیری فارم کی صنعت آنے کے بعد پوری دنیا میں کسی کو آلودگی سے پاک اصلی دودھ مکھن دہی پنیر میسر نہیں۔ یہ کمپنیاں ہمیں کیا پلا رہی ہیں ہمیں نہیں معلوم، ہم تو ان کی مصنوعات پر ایمان لا چکے ہیں ان کمپنیوں کی اخلاقیات *The Corporation* نامی کتاب میں پڑھی جاسکتی ہیں۔سائنس پر تنقید کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ایسی تقدیس، تکریم، تحریم نہ کی جائے جیسا کہ یہ کوئی الہامی کتاب اور مقدس علم ہے یہ علم نہیں فن ہے Art & Craft ہے۔ یہ کام چلاتا ہے، فائدے پہنچاتا ہے، یہ مادی طبعی، حسی، عقلی دنیا کا علم ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسے تمام علوم کو پرکھنے کا پیمانہ بنانا اسے الحق اور الخیر کی تلاش کا منہاج سمجھنا اسے سب سے برتر بہتر علم سمجھنا جہالت ہے۔ یہ حضرات Feryarberd کی کتاب *Against Method* یا اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین کی کتاب *Six Easy Pieces* پڑھ لیں تو سائنس سے ان کی مرعوبیت چند لمحوں میں ختم ہو جائے گی۔سیکولر جامعات سے وابستہ اہلِ علم سے متعلق جو کچھ اوپر تحریر کیا گیا ہے اس معاملے میں صرف ایک استثناء ہے☆ وہ لاہور کے ممتاز دانشور عطاء اللہ صدیقی مرحوم کا ہے۔

لاہور میں ماہنامہ محدث کے محترم مدیر جناب حسن مدنی کی دعوت پر جامعہ اسلامیہ لاہور میں طلباء، اساتذہ اور محترم علماء کرام سے گفتگو کا موقع ملا۔ اس تقریب میں محترم عطاء اللہ صدیقی صاحب بھی شریک تھے۔ راقم نے عہدِ حاضر، جدید مغربی ترقی سائنس وٹکنالوجی، ہیومن رائٹس کے حوالے سے معروضات پیش کیں جنھیں نہایت توجہ سے سنا گیا تقریر کے اختتام پر محترم عطاء اللہ صدیقی صاحب نے سوالات کے بجائے راقم کی گفتگو کے بارے میں چند معروضات پیش کرنے کی اجازت

☆ اس میں شک نہیں کہ عالم اسلام اور پاکستان کی جامعات میں مغربی فکر وفلسفے کا تنقیدی مطالعہ عموماً شامل نصاب نہیں، جو ہونا چاہیے لیکن جامعی صاحب کا یہ عمومی تبصرہ بہرحال مبالغے پر مبنی ہے کہ پنجاب کی جامعات اور علمی اداروں میں مغربی فکر و فلسفے کو سمجھنے والا کوئی نہیں مثلاً یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں، جہاں ہم پڑھاتے ہیں، مغربی فکر وفلسفے کا تنقیدی مطالعہ شامل نصاب ہے۔ صفاء انسٹی ٹیوٹ میں اس پہ کام ہو رہا ہے، بعض دیگر ادارے اور افراد بھی اس ضمن میں کام کررہے ہیں۔ جیسا کہ البرہان ہی میں ان شاء اللہ وہ دیکھیں گے۔ ہماری دیرینہ درخواست اور مطالبہ کے باوجود جامعی صاحب اور ان کے حلقۂ احباب کی جانب سے مغربی فکر وفلسفے کے اسلامی تناظر میں تنقیدی مطالعے پر بھی کوئی مربوط و مرتب اور ٹھوس علمی کام (خصوصاً اردو میں) ابھی تک سامنے نہیں آیا، جس کے ہم منتظر ہیں۔ امین

صدرِ مجلس سے طلب کی اور نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ہیومن رائٹس پر کام کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام اور ہیومین رائٹس میں کوئی تضاد نہیں ہے ان میں ہم آہنگی ہے سائنس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔۔۔ راقم نے جواب الجواب کے موقع پر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہیومن رائٹس پر ہم گزشتہ دس سال سے کام کررہے ہیں اس کی تاریخی، تہذیبی، فلسفیانہ اساسات پر مصادر و ماخذات کی روشنی میں مختلف رفقاء نے ایک ہزار صفحات تحریر کئے ہیں کراچی پہنچتے ہی وہ صفحات آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا ان کے مطالعے کے بعد آپ اپنی رائے سے مطلع فرمایئے گا اگر ہم غلطی پر ہوئے تو ہم بلا تکلف اپنے موقف سے رجوع کرلیں گے جہاں تک سائنس کے حوالے سے آپ کے تحفظات ہیں وہ درست ہیں کہ تین سو سال پر محیط سائنس وٹکنالوجی ترقی کے حوالے چند لمحوں میں کی گئی تنقید فہم وفکر سے بالا ہوتی ہے اس ضمن میں ہم تین سال سے کام کررہے ہیں اور ہم نے تین ہزار صفحات تحریر کئے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں ارسال کئے جائیں گے ان کے مطالعے کے بعد آپ جو کچھ رائے دیں گے وہ ہمارے لئے نہایت قابلِ قدر ہوگی اور ہم آپ کی تنقیدات کی روشنی میں اس وقت یقیناً استفادہ کریں گے ۔جن چیزوں میں اصلاح کی، ترمیم کی، رجوع کی، ارتقاء کی ضرورت ہوگی ہمیں اس میں کوئی تامل نہ ہوگا فی الحال آپ کی محتاط رائے قبل از وقت ہے آپ توقف فرمائیں۔اگلے دن کراچی پہنچتے ہی ایک ہزار صفحات جو ہیومن رائٹس کی تاریخ اور فلسفے سے متعلق تھے جناب حسن مدنی صاحب اور کامران طاہر صاحب کے ذریعے ان تک پہنچادیئے گئے چند ہفتوں بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے انھوں نے خود رابطہ کیا اور اعتراف کیا کہ انسانی حقوق کے منشور کو ہم نے یورپ کے تاریخی اور فلسفیانہ تناظر میں اس طرح نہیں دیکھا ڈاکٹر وہاب سوری کے پی ایچ ڈی کے مقالے نے انھیں بہت متاثر کیا جو اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls پر تھا اور جس میں انسانی حقوق، لبرل ازم اور جدید لبرل ریاست کے خدوخال کی حقیقت نہایت عالمانہ وفلسفیانہ انداز میں بیان کی گئی ہے انھوں نے بہت سی کتابیں طلب فرمائیں، بے شمار حوالوں کے لئے بار بار رجوع کیا۔سائنس وٹکنالوجی سے متعلق راقم نے اپنی معروضات کے ضمن میں انھیں دو ہزار صفحات بھیجے انھوں نے سب سے پہلے کتاب میں درج تمام حوالوں کی اصل کتابیں طلب فرمائیں اور براہِ راست مصادر کا مطالعہ شروع کیا تو ان پر حیرت کا جہان کھل گیا خاص طور پر فیرابینڈ کی کتاب Aganist Method پڑھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے جب پاپر کے فلسفہ Falsification کی تفصیلات ان کی نظر سے گزریں تو ان کی حیرت عروج پر تھی۔اس صدی کے

آئن اسٹائن فائن مین جو کوانٹم فزکس کا سب سے بڑا سائنسداں اور نوبل انعام یافتہ ہے اور جس کا کمال یہ ہے کہ طبیعات کی دنیا میں یہ پہلا آدمی ہے جس نے طبیعات کے بے شمار عقدے ریاضی کی مساواتوں [Equations] کی بجائے صرف تصاویر سے حل کر دیے جب کہ علمِ طبیعیات کی تاریخ میں کوئی سائنسداں طبیعات کے کسی مسئلے کو آج تک ریاضی کی مساوات کے بغیر حل نہیں کرسکا۔ اس کی کتاب Six Easy Peices جو سائنس کی حقیقت سے متعلق ہے ان کو پیش کی گئی تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کا ردعمل یہ تھا کہ عالمِ اسلام میں تو سائنس کے بارے میں حد درجہ تقدیس کی فضاء غالب ہے لیکن یہ مصادر و منابع تو سائنس کے بارے میں بھی کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔ کاش وہ زندہ رہتے تو اپنے سدا بہار قلم سے ان مباحث و مسائل پر نہایت پر اثر تحریریں لکھتے اور امت کی رہبری فرماتے۔

پنجاب کے سفر کا حاصل جناب عطاء اللہ صدیقی سے اتفاقی ملاقات تھی میں نے پاکستان کے سیکولر اداروں سے فارغ التحصیل مذہبی مزاج رکھنے والے اہلِ علم میں انھیں واحد فرد پایا جنھوں نے ان مشکل فلسفیانہ مباحث، سائنس پر نقد و نظر جیسے نازک موضوعات میں اس قدر دلچسپی ظاہر کی اور ان عنوانات پر مطالعے کے لئے کتابوں کو منتخب کیا۔ چند کتابیں جو انھوں نے طلب کیں اس کی فہرست درج ذیل ہے کیونکہ یہ تمام اہلِ علم کے لئے فائدہ مند ہے لہٰذا اس کا حوالہ علمی حلقوں کے لئے کارآمد ہوگا:

Hugh Lauder, Phillip Brown, Jo-Anne Dillabough and A.H. Halsey: *Education, Globalization and Social Change,* 2006, Oxford University Press.

Theodor Adorno and Max Horkheimer: *Dialectic of Enlightment*. 1986, Thetford Press.

Jurgen Habermas: *On the Logic of the Social Science*. 1988, MIT Press Cambridge.

Peter Singer: *Applied Ethics* 1986, Oxford University Press.

Richard Rorty: *Objectivity, Relativism, and Truth Philosophical Papers*. 1991, Cambridge University Press.

Ernest Gellner: *Nations and Nationalism*. 2006 Blackwell Publishing.

Tony Evans: *The Politics of Human Rights A Global Perspective*. 2005 Pluto Press London.

R.P.Feynman: *Six Easy Pieces Essential of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher* 1995 Helix Books Addison-Wesley Publishing Company.

Richard Bellamy: *Rethinking Liberalism* 2000, Pinter London and New York.

A.D. Smith: *Nationalism and Modernism* 1998 Routledge London and New York.

Jared Diamond: *Guns, Germs And Steel A Short History of Everybody For the Last 13,000 Years* 2005 Vintage Books London.

Paul Feyerabend: *Against Method,* 2010, Verso London New York.

A.F. Chalmers: *What is This Thing Called Science*. 1982, Open University Press.

Wolfgang Sachs: *The Development Dictionary A Guide to Knowledge as Power*. 1992, Zed Books London and New Jersey.

Milton Friedman: *Capitalism and Freedom,* 2002, University of Chicgo Press

Max Weber: *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism* ,1930, Routledge London

Naomi Wolf: *The Beauty Myth How Images of Beauty Are Used Against Woman,* 2002, Harper Perennial

Wolfgang Smith: *Cosmos and Transcendence Breaking Through the Barrier of Scientistic Belief,* 2005, Suhail Academy Lahore Pakistan

Amy Chua: *World on Fire How Exporting free Market? Democracy Breads Ethnic Hatred and Global Instability,* 2004,

Anchor Books

جناب صدیقی صاحب نے مغرب کے گہرے مطالعے کے سلسلے میں منتخب کتب کی فہرست بھی طلب کی تھی انشاء اللہ وہ فہرست دوسرے مضمون میں پیش کی جائے گی۔

محتاج دعا

خاکسار

خالد جامعی

یاد رفتگان ڈاکٹر محمد امین

إلی رحمة اللہ

ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت

یہ غالباً ۱۹۸۳ء کی بات ہے جب ہم نے پہلی دفعہ ریاض (سعودی عرب) میں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب کو دیکھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، سر پہ سادہ سی ٹوپی، پاؤں میں سادہ سی چپل، ہاتھ میں تسبیح جس کے دانے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے، ہر وقت گرتے رہتے۔ یہ 'انداز' جماعت اسلامی کے حلقے میں نامانوس تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے سوالات اوراعتراضات بھی کیے جنہیں انہوں نے خوبصورتی سے جواب دے کر ٹال دیا۔ وہ اس وقت جماعت اسلامی سعودی عرب کے نظم کے امیر تھے۔ ہم اُس وقت بھی حیران ہوئے تھے اور آج بھی حیران ہیں کہ انہوں نے کس طرح جماعت اسلامی اور تصوف کے اجتماعِ ضدین کو عمر بھر نبھایا اور نہ صرف نبھایا بلکہ ان کا حق ادا کر دیا یہاں تک کہ ان دونوں گروہوں کے بزرگ آخر وقت تک ان سے راضی تھے اور وہ خود بھی مطمئن اور خوش تھے۔

انہوں نے ایسی پاکیزہ اور مطابقِ شریعت زندگی گزاری اور چند واقعات ایسے ہوئے کہ ان کے جاننے والوں کے حلقے میں یہ معروف ہوگیا کہ وہ مستجاب الدعوۃ ہیں۔ جماعت اسلامی کی کسی انتخابی شکست کے موقع پر برادرِ عزیز صلاح الدین صاحبؒ (ایڈیٹر تکبیر کراچی) نے تنقیدی شذرات لکھے اور کچھ یوں ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب اور صلاح الدین صاحب میں ٹھن گئی۔ اس مناظرہ بازی کا اختتام یوں ہوا کہ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے صلاح الدین صاحب کو مباہلہ کا چیلنج دے دیا۔ ہم گھبرائے کہ صلاح الدین صاحب کہیں یہ دعوت قبول نہ کرلیں کہ لنگوٹے کے وہ بھی سُچے تھے☆ اور ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ صلاح الدین صاحب کو خبردار کریں کہ تازہ تکبیر آگیا (کہ ہفت روزہ تھا ـــــ اور آج کل ہفتہ اتنی تیزی

☆ مطلب یہ کہ وہ بھی عفیف اور صاحب کردار تھے

سے گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا) تو ہم نے جلدی سے رسالہ کھولا اور یہ دیکھ کر مطمئن ہوئے کہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کرتے ہوئے اپنی بات کہی اور بحث سمیٹ لی۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ بعض واقفان حال نے انہیں ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے مستجاب الدعوۃ ہونے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے اعراض کیا۔

اب ہماری بپتا سنیے کہ ہم نے اپنے قد سے بڑے بڑے تعلیمی اور اصلاحی منصوبے شروع کر رکھے ہیں اور مسلکی و جماعتی تحزب اور مادی وسائل سے بھی محروم ہیں لہٰذا مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ انہوں نے ہماری کمر توڑ رکھی ہے لہٰذا ہم اس ہستی کی پناہ اور مدد بھی طلب کرتے رہتے ہیں جو مسبب الاسباب اور قوی و قیوم ہے اور جس کی نصرت بغیر وسائل کے بھی معجزے رونما کر سکتی ہے؟ اور کوئی حقیقی بزرگ ملے تو اس سے دعا کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک تربیتی و اصلاحی نشست میں، جس کے آخر میں دعا اکثر ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب کرواتے تھے، ہم نے ان سے دعا کی خصوصی درخواست کی۔ اتفاق سے اسی وقت یہ فیصلہ ہوا کہ پہلے نماز پڑھ لی جائے اور ڈاکٹر صاحب سے جماعت کرانے کے لیے کہا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے عشاء کی نماز میں سورہ بقرۃ کی آخری آیات تلاوت کیں جن میں یہ بھی آتا ہے کہ: '' لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' گویا انہوں نے ہماری درخواست کا جواب بالواسطہ طور پر دے دیا۔ لیکن مایوس ہونے والوں میں سے ہم بھی نہیں، چنانچہ پچھلے سال ہم نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے باقاعدہ استفادہ کرنا چاہیے کہ اس سے ہماری اصلاح بھی ہوگی، ایمان و یقین بھی پختہ ہوگا اور ان سے دعا کرانے کا موقع بھی ملے گا۔ ڈاکٹر صاحب سے وقت کی درخواست کی تو الحمدللہ وہ مان گئے۔ چنانچہ ہر منگل کو عصر اور مغرب کے درمیان ان کے گھر پہ میری ان سے نشست رہتی اور یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا تا آنکہ وہ اپنے بیٹے کے پاس امریکہ چلے گئے۔ چونکہ ان نشستوں میں صرف ہم دونوں ہوتے تھے لہٰذا ان سے استفادے کا اچھا موقع ملا۔ کبھی وہ جو مناسب سمجھتے ارشاد فرماتے اور کبھی میں جو چاہتا عرض کرتا اور وہ میری رہنمائی اور تسلی و تشفی فرماتے۔ ایک دن مَیں کچھ اس مفہوم میں کہہ رہا تھا کہ بعض اوقات آدمی عرصہ تک دعا مانگتا رہتا ہے اور وہ قبول نہیں ہوتی یا برسوں ایک اچھا کام کرتا رہتا ہے اور اس کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ بیٹھے سنتے رہے اور پھر ایک دم جلال میں آ گئے (کہ آخر پٹھان تھے) کہنے لگے ''کیا تم خدا ہو؟ نہیں تم خدا نہیں ہو، تم بندے ہو، تو خدا کے کام کی فکر کیوں کرتے ہو، اپنے کام کی فکر کرو۔ بندے کا کام ہے عبادت و اطاعت میں محنت کرنا۔ اس کا نتیجہ نکالنا اللہ کا کام ہے۔ میاں تم اپنا کام کرو۔ اس کے کام کی فکر نہ کرو۔ وہ نہ اندھا ہے نہ بہرہ اور نہ ناانصاف۔ اپنے کام سے کام رکھو! کیا تم نے اس کا حق

ادا کر دیا ہے؟'' وہ بغیر رُکے بولتے رہے اور میں دم بخود سنتا رہا۔

انہوں نے ہمارے لیے کئی بار دعا کی اور ہمیں یقین ہے کہ ان کی دعا ہمارے لیے، ان شاء اللہ ،قبول ہوگی —— لیکن دعا تو وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بھی کرتے تھے اور کشمیر، فلسطین اور چیچنیا کی آزادی کے لیے بھی ہمیشہ کرتے تھے۔ تو دعائیں قبول کرنے کا اللہ کا ایک اپنا نظام ہے اور ہماری کوتاہ بین نظریں بسا اوقات ان دور رس فیصلوں کی حکمتوں کو سمجھ نہیں پا رہی ہوتیں جو احکم الحاکمین کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنی اصلاح اور تزکیے کی بہت فکر تھی۔ نوجوانی ہی میں مولانا عبدالغفور مدنیؒ کی بیعت کرلی۔ وہ شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریاؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور دیگر بزرگوں کے ساتھ ملاقاتوں کے احوال سناتے رہتے تھے۔ عمر بھر سعودی عرب میں ملازمت کی اور زیادہ عرصہ طائف میں رہے۔ پاکستان آنے کے بعد اور مولانا مدنیؒ کی رحلت کے بعد اپنی اصلاح کی فکر میں غلطاں رہتے اور موزوں مربی کی تلاش میں رہے اور بالآخر حضرت احمد جاوید صاحب کی شخصیت پہ مطمئن ہوکر ان سے وابستہ ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب کا جسد خاکی پی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور کی مسجد کے ساتھ پارک میں رکھا ہوا تھا۔ نماز جنازہ کے لیے لوگ صفیں بنا رہے تھے کہ ان کے ایک قریبی دوست اور ساتھی (ڈاکٹر منصور علی صاحب) نے اٹھ کر ان کی نیکی، تقویٰ اور پاکیزہ زندگی کی شہادت دی اور کہا کہ میرے یہ ذاتی علم میں ہے کہ جب وہ طائف میں تھے اور ان کی تنخواہ 7 ہزار اور کچھ ریال ماہانہ تھی تو وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے 2 ہزار ریال نکال کر باقی تنخواہ ہر ماہ باقاعدگی سے اللہ کی راہ میں دے دیا کرتے تھے اور یہ ان کا مستقل معمول تھا۔۔۔ یہ کہنا آسان لگتا ہے لیکن عمل میں اتنا آسان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کی حسنات قبول فرمائے اور ان کی خامیوں، کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہمیں ان جیسا اخلاص، تقویٰ اور آخرت کی فکر عطا فرمائے۔ حق مغفرت کرے، عجب اطاعت گزار عبد تھا۔

حافظ نذر احمد

۴ ستمبر ۲۰۱۱ء کی صبح ڈاکٹر مزمل احسن شیخ صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ حافظ نذر احمد صاحب اللہ کے پاس چلے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حافظ صاحب نے جس طرح خاموشی سے دین کی خدمت کی اور نام و نمود کی بجائے گم نامی کو پسند کیا، اس پر ہمیں توقع نہ تھی کہ ان کے جنازے پر جامعہ نعیمیہ اندر باہر سے بھری ہوگی تاہم شہر کے اکثر دینی حلقوں کے لوگ وہاں موجود تھے جنہوں نے ان کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چلئے یہ بھی ان کی سعادت ہے۔۔۔ کہ لوگ زندوں کی قدر

نہیں کرتے تو مرجانے کے بعد ہی دعائے خیر سے یاد کر لیتے ہیں۔

حافظ صاحب نے نوجوانی ہی میں کسی وجہ سے اسلامیہ کالج کی اسلامیات کی لیکچررشپ چھوڑ دی اور پھر کیرئیر کی فکر چھوڑ کر دین کی فکر میں لگ گئے اور پھر خاموشی سے عمر بھر اسی کام میں لگے رہے۔ انہوں نے شبلی کالج بھی چلایا جو اگرچہ وسائل کی کمی اور حافظ صاحب کے دنیاداری کے داؤ پیچ نہ جاننے کی وجہ سے کوئی بڑا ادارہ تو نہ بن سکا تاہم اصلاح تعلیم میں حافظ صاحب کا منہج بھی وہی تھا جو اب ہمارا ہے اور گو انہوں نے اس کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی لیکن تعمیر ملت سکول ملتان کے میجر مسرت بیگ صاحب، اسلامیہ سکول سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے مولانا عبدالجبار غازی صاحب اور ماہر تعلیم سید شبیر بخاری صاحب (مدظلہ العالی —— شاہ صاحب بڑھاپے، بیماری اور ضعف کے دن جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں اپنے بیٹوں کے پاس گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازے) سے مل کر اصلاحِ نصاب اور تربیت اساتذہ کا کام کرتے رہے۔ انہوں نے شبلی کالج میں کئی عمدہ تجربے کیے اور ان کے بارے میں بتاتے رہتے تھے مثلاً فرمایا کہ میں نے کبھی فیس کے پیسے طلبہ سے گن کر نہیں لیے لیکن وہ کبھی کم نہیں نکلے۔ طلبہ کو بتاتے کہ ۱۵ شعبان دراصل استقبال رمضان کا موقع ہے لہٰذا پٹاخے اور حلوے اس کا موزوں پیرایۂ اظہار نہیں ہیں، تو شب برأت کے دوسرے دن طلبہ سے پوچھتے کہ کس کس نے آتش بازی کی؟ تو جواب سے پتہ چلتا کہ اکثر طلبہ نے نہ صرف خود ان کی ہدایت پر عمل کیا بلکہ گھر کے دوسرے بچوں سے بھی اس پر عمل کرایا۔ ٹک بنک کا تجربہ بھی انہوں نے کیا۔

خدمت قرآن ان کا ایک بڑا موضوع اور ہدف تھا۔ باکس بنا کر لفظی ترجمے کا کام سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔ بعد میں کئی لوگوں نے اس خدمت میں حصہ لیا۔ ایک دفعہ میں نے ذکر کیا کہ میں نے اس طرح کے سارے کام کو جمع کیا ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ کر رہا ہوں تو کسر نفسی سے فرمایا کہ میرا کام کوئی ایسا وقیع اور علمی نہیں ہے بس خدمت کے نقطۂ نظر سے کر دیا تھا۔ ان کی یہی بے نفسی اور بے لوثی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ انہوں نے اپنا ترجمۂ قرآن ہر مسلک کے ایک بڑے عالم کو دکھایا اور اس کی ابتداء میں لکھا کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اور یہ سب کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ وہ اتحاد امت کے داعی تھے اور فرقہ وارانہ اختلافات کو کم اور ختم کرنا ان کا ایک ہدف تھا۔ قرآن حکیم کے خط و کتابت کورسز انہوں نے جاری کیے، جیلوں میں قیدیوں کو قرآن پڑھانے کی جدوجہد انہوں نے کی۔ عمومی اسلامی دعوت کے علاوہ، جس کے لیے انہوں نے کئی طرح کے خط و کتابت کورسز جاری کر رکھے تھے، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور مسلمانوں کو عیسائی ہونے سے بچانے کے

لیے جدوجہد کرنا ان کی دینی سرگرمیوں کا ایک پہلو تھا۔ اس کے لیے انہوں نے 'اسلامی مشن' کے قیام اور تنظیم میں حصہ لیا اور اس کی سرگرمیوں کو منظم کیا۔ دینی مدارس کے بارے میں ان کی جائزہ رپورٹیں بھی انتہائی اہمیت کی حامل تھیں اور یہ کام انہوں نے اُس وقت کیا جب کوئی دینی مدارس اور ان کی اہمیت سے اس طرح واقف نہیں تھا جیسے کہ اب لوگ مغرب کی مخالفت کی وجہ سے ہیں۔

حافظ صاحب کی ایک خوبی پابندئ وقت تھی۔ ایک صاحب نے ان سے حدیث کے حوالے سے کوئی کام کروانا چاہا۔ حافظ صاحب نے وقت نہ ہونے کی وجہ سے معذرت کرلی۔ اس نے اصرار کیا تو کہنے لگے کہ چھوڑ جائیں چار مہینے میں یہ کام ہوجائے گا۔ اس نے کہا اتنے تھوڑے سے کام کے لیے چار مہینے۔ حافظ صاحب نے کہا: آپ کے اصرار پر میں نے اپنے نظام الاوقات کا جائزہ لیا ہے۔ میں اس میں سے صرف دس منٹ روزانہ دے سکتا ہوں۔ آپ یہ کام چھوڑ جایئے اور چار مہینے سے پہلے نہ آیئے۔ وہ چار مہینے بعد آئے تو کام تیار تھا۔

تین چار سال پہلے حافظ صاحب کی بینائی کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی تو ان کی ساری دینی و دعوتی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں۔ ایک دفعہ راقم ملنے گیا تو ان کے بیٹے نے کہا کہ وہ تو دیکھ نہیں سکتے آپ کو کیسے پہچانیں گے؟ میں نے اصرار کیا کہ مجھے ملوائیں تو سہی۔ جب ملے اور میں نے کہا ''حافظ صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ، آپ کی صحت اب کیسی ہے؟'' تو فوراً پہچان لیا۔ بڑی شفقت سے ملے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان پر رقت کا غلبہ ہورہا تھا اور بار بار کہتے تھے کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نبی کریم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے۔

یہاں ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے ان لوگوں کی اولاد اور لواحقین سے جنہوں نے اپنی زندگی دینی جدوجہد کی متنوع سرگرمیوں میں گزاردی کہ جب وہ بوڑھے اور کمزور ہوجائیں اور خود حرکت کرنا اور چلنا پھرنا ان کے لیے دوبھر ہوجائے تو ان لواحقین کا اتنا ہی فرض نہیں ہے کہ وہ ان کے کھانے پینے اور ان کے لباس کا خیال رکھیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کی پبلک لائف کا بھی خیال کریں مثلاً ان کے حلقۂ احباب کو بتادیا جائے کہ وہ ہفتے میں ایک یا دو دن فلاں وقت ملاقات کے لیے میسر ہوں گے۔ یہ لوگ جنہوں نے ساری زندگی دینی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہوتا ہے، جسمانی طور پر کمزور ضرور ہوتے ہیں لیکن اکثر ذہنی طور پر مستعد ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے اور ان کے عمر بھر کے تجربات سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسی سرگرمیوں سے متعلق سوچنا اور کچھ کہنا خود ان کے لیے بہت فرحت انگیز تجربہ ہوتا ہے اور وہ اپنے تجربات نئی نسل سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ ان کے ساتھ ظلم ہے کہ انہیں کمرے میں بند کردیا جائے اور انہیں کسی سے ملنے جلنے کے مواقع نہ دیے

جائیں۔ بلکہ اولاد کی سعادت مندی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ ہفتے میں کم ازکم ایک یا دو دن انہیں لوگوں سے ملنے کا موقع ضرور دیں تا کہ ان کے لیے زندگی کا ایک روزن ضرور کھلا رہے اور وہ جیتے جی زندہ درگور نہ ہوجائیں اور جب ان کی موت کا اعلان ہوتو اکثر لوگ یہ کہتے نہ پائے جائیں کہ اچھا یہ بزرگ ابھی زندہ تھے ہم تو سمجھے تھے کہ فوت ہو چکے ہیں۔

حافظ صاحب نے ایک بھرپور دینی زندگی گزاری لیکن کبھی کوئی جماعت یا ادارہ نہیں بنایا۔ ان کی ساری جدوجہد اخلاص، سادگی، بے نفسی اور بے لوثی پر مبنی تھی۔ نہ نام ونمود کی خواہش نہ نام وری کی تمنا۔ قرآن کی خدمت، اسلام کی دعوت، تعلیم کی اصلاح، مسلک پرستی سے دوری اور اتحاد امت کی خواہش۔ یہ تھے ان کے بنیادی اوصاف۔ حق مغفرت کرے عجب اطاعت گزار بندہ تھا۔

تعارف کتب مبارک حیدر

'تہذیبی نرگسیت' اور 'مغالطے مبالغے'

ہمیں ایک فاضل دوست نے توجہ دلائی کہ مبارک حیدر صاحب کی یہ دو کتابیں دیکھیں (مطبوعہ سانجھ، ٹیمپل روڈ، لاہور) اور ان پر البرہان میں تفصیلی تبصرہ کریں کہ یہ کتابیں نہایت زہریلی ہیں اور ان کا تفصیلی پوسٹمارٹم ہونا چاہیے۔ البرہان کے ایک ادارتی مشیر نے کتابیں دیکھ کر رائے دی کہ انہیں گمنام ہی رہنے دیا جائے اور ان کا تعارف کرا کے خواہ مخواہ ان کی 'مشہوری' نہ کی جائے۔

مبارک حیدر صاحب نے 'مغالطے مبالغے' میں چھ مغالطوں اور چار مبالغوں پر قلم اٹھایا ہے اور ان چھ مغالطوں کا رد کرتے ہوئے انہوں نے اندازاً چھ ہزار مغالطے مزید پیدا کر دیے ہیں اور چار مبالغوں کا رد کرتے ہوئے ان میں کم از کم چار ہزار مبالغوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی حال 'تہذیبی نرگسیت' کا ہے کہ اس میں وہ علماء، اسلامی تحریکوں، غلبۂ اسلام، نفاذِ شریعت، نظریۂ پاکستان، اسلامی حکومت، اتحاد امت اور بحالی خلافت جیسے نظریات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

اگرچہ بعض جگہ انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالے بھی دیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کا پوائنٹ آف ریفرنس اور ان کی فکر کا منبع نہ اسلام ہے اور نہ قرآن بلکہ وہ ان چند 'دانشوروں' کی باقیات میں سے ہیں جنہیں کمیونزم وسوشلزم نے مسحور کیا تھا لیکن ان نظریات اور ان کے علمبردار روس کی شکست و ریخت کے بعد وہ مشرف بہ امریکہ و تہذیب مغرب ہوگئے ہیں گویا ان کی فکر کمیونسٹ زندیقیت اور مغربی تہذیب کے الحاد کا جہل مرکب ہے۔ یوں مبارک حیدر صاحب کی یہ دونوں کتابیں اسلامی حوالے سے فکری ژولیدگی اور نظریاتی خلفشار کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور اپنے قاری میں یہی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔

اتنی سخت تنقید کے بعد ناانصافی ہوگی اگر ہم مصنف اور ان کی کتابوں کی بعض خوبیوں کا ذکر نہ

کریں۔ مصنف نے ہمارے معاشرے اور اس کے مختلف طبقات میں پائے جانے والے تضادات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور انہیں ابھارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر تضادات موجود ہیں لیکن ہم نے ان پر آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اگر کوئی ان پر بولے تو وہ گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ اگر ہمیں اپنے معاشرے کی بقاء ،استحکام اور حسن سے دلچسپی ہے تو ہمیں خود احتسابی کو اپنانا ہوگا اور اپنی بدصورتیوں کے اظہار کو برداشت کر کے ان کا علاج کرنا ہوگا—— لیکن یہ کام مین اسٹریم کے اندر رہ کر ہونا چاہیے نہ کہ مبارک حیدر صاحب کی فکر کے مطابق۔

مصنِف اور مصنَف کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات ٹھنڈے دل و دماغ سے کرتے ہیں۔ وہ نہ جذباتی ہوتے ہیں اور نہ پھکڑ بازی پہ اترتے ہیں۔ تھوڑی بہت تلخی کا تو نفسیاتی جواز بھی ہے اور وہ گوارا بھی ہونی چاہیے گو جدید اسلامی تحریکوں کے نوجوان کارکنوں کے لیے ان کی تحریریں اشتعال انگیز ثابت ہو سکتی ہیں۔